انڈو یجوئل لینڈ

انفرادی آزادی کے لئے کوشاں

لیاری، گورنگی اور سلطان آباد کے نوجوانوں کی داستانیں

لیاری، گورنگی اور سلطان آباد کے نوجوانوں آپ بیتی

مدیر اعلیٰ: گلمینہ بلال احمد
محققین: ذوالفقار حیدر، سُندس سیدہ، یحییٰ احمد، فرحان خالد خان
کوارڈینیشن: شوکت علی اَشرف
ڈیزائنر: عدیل امجد

یہاں بیان کردہ معلومات سول سوسائٹی کے مختلف حصوں کی اعانت کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی تھی۔ تمام تر مدد کے باوجود، مدیرِ اعلیٰ کسی بھی قسم کی غلطیوں کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔

انڈویجوئل لینڈ
انفرادی آزادی کے لئے کوشاں
مکان نمبر۱۲بی، گلی نمبر۲۶،
ایف ایٹ ون، اسلام آباد۔ پاکستان
ٹیلی فون نمبر: +92-51 2 25 34 37, 2 25 34 38
ای میل: info@individualland.com
ویب سائٹ: www.individualland.com

تعداد اشاعت: ۲۰۰
اسلام آباد، ۲۰۱۴

فہرست

۱	پیش لفظ	۱
۲	جائزہ	۲
۳	آغاز	۳
۴	فیلڈ ریسرچ چننا اور ان کی خدمات حاصل کرنا	۴
۵	سوالنامہ	۴
۶	گینگ کے سابقہ ممبران تک رسائی	۴
۷	تشدد سے متاثرہ افراد تک رسائی	۴
۸	ان سنی ان کہی	۴
۹	☆ طاقت کی حوص	۵
۱۰	پُرتشدد افراد کی داستانیں	۵
۱۱	بری صحبت	۵
۲۳	جائیں تو جائیں کہاں	۱۰
۲۴	بدلہ	۱۱
۲۵	☆ شناخت کی لالچ	۱۱

پیش لفظ

دنیا کی تاریخ پر تشدد واقعات سے بھری پڑی ہے۔ محظ پاکستان ہی کُرہِ ارض پر تن تنہا نہیں جو گینگ وار سے متاثر ہو رہا ہے۔ پاکستان کے علاوہ بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے جن میں امریکا، انڈیا، آسٹریلیا، جاپان، برطانیہ، اٹلی اور کینیڈا کے چند علاقے بھی گینگ وار سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ ہمسایہ ملک بھارت کے علاقے ممبئی کی تاریخ گینگ وار کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

پاکستان کے صوبہ سندھ کے شہر کراچی میں ہونے والی گینگ وار نے اس پُر امن شہر کو قبرستان کے سناٹوں اور خوف کے سائے تلے لا کھڑا کیا ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں آئے دن ہڑتالیں ہوتیں ہیں، ہمارے ہی نوجوان اپنے ہی ہاتھوں سے ملک کے اثاثے جلانے کے بعد ملک کی معاشی تباہی کا رونا روتے ہیں۔ یہ شہر پاکستان کا مالی اور کاروباری دارالحکومت ہے، لیکن دن بدن حالات اسے تنزلی کی طرف دھکیلتے جا رہے ہیں۔

یہاں پر رہنے والے شہری بھی غیر محفوظ ہیں، نا جانے کس وقت کیا ہو جائے اس کا کسی کو کوئی اندازہ نہیں البتہ ایک اندازے کے مطابق گزشتہ ایک دہائی میں سینکڑوں افراد تشدد کا نشانہ بنے ہیں۔ عسکریت پسند اور انتہا پسند گروہ بہت منظم طریقے سے نوجوانوں میں اپنا اثر ورسوخ قائم کر کے، ان کو انتہا پسندی کی طرف راغب کرتے چلے جا رہے ہیں۔ نوجوان ہمارے ملک کا قیمتی اثاثہ ہیں چنانچہ ان کے تشدد پسندانہ رویوں کے بارے میں آگاہی دلانا انتہائی ضروری ہے تا کہ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کیے جا سکیں۔

کراچی جو کہ روشنیوں کے شہر کے نام سے جانا جاتا تھا نہ جانے اس شہر کو کیا ہوا کہ خوشیوں بھرے اس شہر کو گویا کسی آسیب نے جکڑ لیا ہو۔ اب جب بھی کراچی کی بات آتی ہے تو پہلی چیز دن بدن بڑھتی ہوئی شر پسندی، بدامنی اور تنزلی کی طرف جاتے ہوئے حالات ہمارے دل میں خوف پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ اس ہستی کی آخری آرام گاہ جس نے ہمیں آزاد ملک دلا کر ہمیں آزادی سے جینا سکھایا۔ یہ وہ سرزمین تھی جو امن اور بھائی چارے کی مثال تھی۔ جس شہر کا مقصد ایک قوم کے لیے آزاد سرزمین پر سکھ اور چین کی زندگی فراہم کرنا تھا، وہاں ہمارے اپنوں نے ہی ہمارا سکھ چین تو کیا ہمارے اپنوں کو ہی ہم سے چھین لیا۔

کراچی میں بہت سے رنگ و نسل کے لوگ جیسا کہ سندھی، بلوچی، پشتون اور مہاجر آباد ہیں۔ لیکن یہ کیا؟ یہ قوم اتنے حصوں میں کیسے بٹ گئی؟ ایک صوبے میں رہنے والے لوگ سندھی، بلوچی، پشتون اور مہاجر کہہ کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہو گئے؟ یہ الگ صوبوں کی بات نہیں یہ سندھ میں موجود اسی روشنیوں کے شہر کی بات ہو رہی ہے جہاں ان تمام زبانوں کے لوگ بستے ہیں۔ سندھی، بلوچی، پشتون اور مہاجر یہ تو ہماری مختلف ثقافتوں کی پہچان تھی یہ تو ہمارا فخر تھا۔ نہ جانے یہ کب ہونے لگا کہ اس پہچان کو ہمارے اپنے ہی ایک دوسرے کے سر اچھالنے کے لیے استعمال کرنے لگے اور اب لوگ پہچان بتانے کی بجائے پہچان چھپانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

http://www.thenews.com.pk/Todays-News-2-199155-Gang-wars-alone-cant-cripple-countries-snatch-peace

جائزہ

کراچی جو دن بدن گینگ وار کے بڑھتے ہوئے واقعات سے متاثر ہو رہا ہے، اس میں خاص طور پر تین علاقے لیاری، سلطان آباد اور کورنگی زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ کراچی کے ان تین علاقوں کے بارے میں جب بھی کوئی خبر آتی ہے، اس میں گینگ وار، ٹارگٹ کلنگ، منشیات فروشی اور ہڑتال جیسے واقعات سرِ فہرست ہوتے ہیں۔ تیزی سے طول پکڑتے ان مسائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں بسنے والوں کی زندگیاں ہر وقت موت کے دہانے پر ہوتی ہیں۔ ان علاقوں کے نوجوان جن کے ہاتھ میں قلم ہونا چاہیئے تھا ان کے ہاتھوں میں اسلحہ ہے، ان کے ہاتھ قلم کی سیاہی کی بجائے لوگوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

لیاری کا شمار کراچی کے قدیم ترین علاقوں میں ہوتا ہے جو کبھی کھیلوں کے لیے مشہور تھا اور اسے فٹبال کے شدائیوں اور محنت کشوں کا علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ البتہ اب اس علاقے میں گینگ وار خطرناک حد تک پہنچ چکی ہے۔ لیاری دریا کے کنارے موجود بلوچ اکثریت کے اس علاقے نے بے شمار فٹبالروں کو جنم دیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کی زمین کھلاڑیوں کے لیے تنگ ہوتی چلی گئی۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۴ء کے دوران اس علاقے میں گینگ وار کا آغاز ہوا اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ آج لیاری کے نوجوانوں کی اکثریت اپنی پیدائش سے پہلے ہی اس علاقے میں بوئی جانے والی سازش کا شکار ہو جاتی ہے۔ یقیناً ان کو اس حقیقت سے روشناس کرانا ایک نہایت مشکل امر ہے۔

کراچی کا ایک اور علاقہ جو ملیر دریا کے گرد و نواح میں موجود ہے اس کو کورنگی کہتے ہیں، جس کا شمار پاکستان کے اہم اور بڑے صنعتی علاقوں میں ہوتا ہے۔ سندھی، بلوچی، پشتون اور مہاجرین کی ثقافت کا ایک ملا جلا تاثر لیے یہ علاقہ بھی اپنی مثال آپ ہے، لیکن فرقہ واریت اور سیاست کی نظر ہو جانے کے بعد اس کے حالات دن بدن بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ کیماڑی ٹاؤن کے قرب و جوار میں موجودہ پشتون اکثریت کے علاقے سلطان آباد کے حالات بھی ان دونوں علاقوں سے مختلف نہیں۔ نا جانے اس پُر امن شہر میں کھیلی جانے والی خون کی ہولی کا کیا مقصد ہے؟ آخر اتنی درندگی کس لیے!

http://www.mqmktc.org/the-story-of-lyari-a-history-of-the-gang-wars-in-karachis-oldest-town

آغاز

کسی بھی شخص کے گینگ کا حصہ بننے اور تشدد کی کارروائیوں میں ملوث ہونے کے پیچھے کوئی ایک عنصر کارفرما نہیں ہوتا۔ تشدد پسندی اور تشدد کی کارروائیوں میں ملوث ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات ہیں جو ایک شخص کو تشدد پسندی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ آخر وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بدولت چند علاقوں میں تشدد کی کارروائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ تشدد کے باعث کراچی میں بسنے والے سینکڑوں افراد کی زندگیاں موت کے دہانے پر ہیں۔ ٹارگٹ کلنگ، اغوا برائے تاوان اور تشدد ایک معمول بن چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان علاقوں میں گینگ وار اور گینگ کے بڑھنے کی وجوہات کی شناخت اور تشدد سے متاثرہ افراد کی داستانوں پر بھی توجہ مرکوز کی جائے۔

کراچی سے آنے والی خبروں میں ہڑتال، ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان اور جوئے اور نشے کے اڈوں میں اضافے کی خبریں ہمارا دل دھلا دیتی ہیں۔ ان ہی تمام حالات کے پیشِ نظر انڈیجینس لینڈ پاکستان نے ان علاقوں کی جانب سفر کا آغاز کیا جس کا مقصد لیاری، کورنگی اور سلطانہ آباد میں ہونے والے تشدد میں شامل افراد کی کہانیوں کو منظرِ عام پر لانا، ان کو قلمبند کرنا اور آڈیوز کے ذریعے اس کا نشانہ بننے والے افراد کی روداد کو عام کرنا تھا۔ ان میں بہت سے ایسے لوگ شامل ہیں جنہوں نے نوجوانی ہی میں تشدد کی کارروائیوں کا حصہ بن کر نہ صرف ملک کے قیمتی اثاثوں کو نقصان پہنچایا بلکہ بہت سے شہریوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں سے بھی ملاقات کی گئی جو ان حالات اور گینگ کے نوجوانوں کے تشدد کا حصہ بنتے رہے ہیں۔

ریکارڈ کیے گئے انٹرویوز میں ان نوجوانوں کی کہانیاں ہیں جو پُرتشدد واقعات کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر وہ کیا وجوہات ہیں جن کی وجہ سے ہماری نوجوان نسل تشدد کی جانب مائل ہو رہی ہے۔ آخر وہ کون سی وجوہات ہیں جنہوں نے ہمارے نوجوانوں کی آنکھوں پر دولت، لالچ اور خودغرضی کی پٹی باندھ دی ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کے نوجوان سیاست میں حصہ لیں اور ملک کو سیاسی طور پر مستحکم کریں۔ لیکن یہ ایک خوفناک حقیقت ہے کہ ہمارے نوجوان سیاسی پارٹیوں کی سیاست کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آئے دن کراچی کو تنزلی کی طرف دھکیلنے والی قوتیں زور پکڑتی جا رہی ہیں۔ کہیں فرقہ واریت ہے، کہیں انتقام کی آگ، کہیں زبان رنگ اور نسل کی پہچان کسی کی جان لے رہی ہے تو کہیں نوجوانوں کی آنکھوں پر حرص اور لالچ کی پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ دولت کے نشے میں مدہوش یہ نوجوان اپنے انجام سے انجان نہ جانے کتنوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں اور ان کو خود بھی معلوم نہیں کہ نا جانے وہ خود کب کسی کا نشانہ بن جائیں۔

اس سلسلے میں تشدد سے متاثرہ افراد کے لیے سوالات مرتب کیے گئے اور ان کے جوابات ریکارڈ کیے گئے۔ وہ وجوہات جاننے کی کوشش کی گئی جنکی بنیاد پر کوئی تشدد کی راہ اختیار کرتا ہے اور بالآخر اسے چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تشدد کے شکار ہونے والے افراد کی داستانوں اور عوامل کے ساتھ ساتھ وہ پیغامات بھی ریکارڈ کیے گئے جو وہ تشدد پسندوں کو دینا چاہتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان کہانیوں کی مدد سے تشدد کا شکار ہونے والوں اور تشدد پسندوں جنہوں نے بعد میں یہ راستہ ترک کر دیا، یہ کہانیاں پڑھنے والوں کو ان کے پیچھے کارفرما عوامل کے بارے میں جاننے میں مدد حاصل ہوگی۔

اس کتاب میں کل ۱۳۷ انٹرویوز قلمبند کیے گئے جن میں ۱۲۲ افراد وہ ہیں جن کو تشدد کا سامنا کرنا پڑا جبکہ ۱۵ انٹرویوز ان لوگوں کے ہیں جو تشدد کی کارروائیوں میں ملوث رہے ہیں۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ گینگ وار میں شامل ہونے والے زیادہ تر نوجوان طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے ۱۸ سے ۳۰ سال کی عمر کے لوگوں کے انٹرویو کیے گئے ہیں۔ کل انٹرویوز میں سے ۱۲۴ انٹرویو لیاری، ۷ کورنگی اور ۶ سلطان آباد کے علاقوں سے کیے گئے ہیں۔

یہاں ایک مقصد ان لوگوں کی حوصلہ افضائی کرنا بھی تھا جو ان ناپاک دھندوں کو مسترد کر چکے ہیں، تاکہ آئندہ وہ یا کوئی اور اِس جانب پیش قدمی نہ کرے۔ یقیناً گینگ چھوڑنے کی وجوہات کو منظرِ عام پر لانا اور نوجوانوں کو ظاہری طور پر پُرکشش نظر آنے والے دھندے کی حقیقت سے روشناس کرانا بھی ایک

مقصد تھا۔ ان علاقوں کے حالات کے بارے میں پورا پاکستان تو کیا تمام دنیا ہی خبروں کے ذریعے باخبر رہتی ہے۔ ان علاقوں میں رہنے والے وہ گھرانے جن کے بچے گینگ وار کا نشانہ بنتے ہیں اور وہ بچے جوان کو نشانہ بناتے ہیں سبھی اپنے علاقوں کے حالات سے تنگ ہیں اور ڈر و خوف کے سائیوں تلے زندگی گزار رہے ہیں۔ جانے وہ کب کہاں کس کا نشانہ بن جائیں۔ گینگ میں ملوث افراد کا کام صرف بھتہ لینے، ٹارگٹ کلنگ، اغوا برائے تاوان تک محدود ہی نہیں بلکہ ایک نوجوان نے بتایا کہ "ہم گینگ کے لوگ کاروباری لوگوں کے مسئلے حل کراتے ہیں، آج کل تھانے میں مسئلہ حل نہیں ہوتا ہم ایک فون کرتے ہیں اور کام ہو جاتا ہے۔ بعض بڑے تاجروں سے ہم رابطے میں رہتے ہیں وہ ہمیں فنڈ دیتے ہیں اور ہم ان کے مسئلے حل کرواتے ہیں"۔

ان انٹرویوز کے لیے فیلڈ ریسرچرز بھی منتخب کیے گئے تاکہ اِن علاقوں میں تشدد سے متاثرہ افراد اور تشدد پسند افراد کو تلاش کریں اور ان کو انٹرویو کے لیے آمادہ کر سکیں۔ یقیناً یہ ایک آسان مرحلہ نہیں تھا۔ وہ لوگ جو تشدد سے متاثر ہو چکے ہیں ان کو ڈھونڈنا نسبتاً آسان تھا، لیکن انہیں انٹرویو کیلئے آمادہ کرنا ایک مشکل عمل تھا۔ ان کو یہ خوف تھا کہ وہ اپنی کہانیاں سنانے کے گناہ میں دوبارہ تشدد کا نشانہ نہ بن جائیں۔ اسکے ساتھ ساتھ ایسے افراد کے بارے میں معلوم کرنا نہایت مشکل کام تھا جو تشدد کی کاروائیوں میں ملوث رہ چکے ہیں اور اب اپنی حفاظت کی خاطر شناخت تبدیل کرنے پر مجبور ہیں۔

دونوں طرح کے لوگوں کے ساتھ جامع گفتگو کی گئی جو کہ عام طور پر ان کے گھروں میں ریکارڈ کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مختلف محفوظ مقامات کا بھی تعین کیا گیا تھا۔ ایسی جگہوں سے گریز کیا گیا جہاں پر زیادہ رش ہو۔ ایسا کرنے کے پیچھے مختلف عوامل کارفرما تھے جن میں معلومات کی حساس نوعیت، ڈر اور خوف کے ساتھ ساتھ انٹرویو لینے والے کا تحفظ بھی شامل تھا۔ بعض اوقات انٹرویو دینے والا اپنی کہانی بیان نہیں کر پاتا تھا جس کی وجہ سے ایک سے زیادہ دفعہ ملاقات کی گئی اور انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ انٹرویو آڈیو میں ریکارڈ کیے گئے جس کی بنیادی وجہ ان کی شناخت کو پردے میں رکھنا تھا۔ اس کے علاوہ انٹرویو دینے والے بھی کیمرے کا سامنے کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

انٹرویوز ریکارڈ کرنے کے لیے ہمیں جن مختلف مراحل سے گزرنا پڑا وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

فیلڈ ریسرچر چننا اور ان کی خدمات حاصل کرنا

گینگ کے سابقہ ممبران اور تشدد سے متاثرہ افراد کے انٹرویوز کے لیے ریسرچرز کو تجربے کی بنیاد پر منتخب کیا گیا اور ان کی قابلیت کو مدِ نظر رکھا گیا کہ ان میں اتنی صلاحیت ہو کہ وہ تشدد سے متاثرہ افراد کو اطمینان میں رکھتے ہوئے اور ان کی حوصلہ افضائی کرتے ہوئے انٹرویو لیں۔ اس کے علاوہ یہ وہ علاقے ہیں جن میں کسی بھی وقت حالات بگڑ سکتے ہیں۔ اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ ان علاقوں میں کوئی بھی غیر بندہ جائے تو اس پر نظر رکھی جاتی ہے، اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے ہم نے ایک ایسے ریسرچر کا انتخاب کیا جو لیاری کے علاقے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اوقات کار کا تعین کرنے کے بعد تشدد سے متاثرہ افراد کو علاقے سے باہر کسی مقام پر بلا لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ۳۷ انٹرویوز میں چند افراد ایسے بھی تھے جن کی جانب سے ریسرچرز کو بھی بہت سے سوالات کا سامنا کرنا پڑا، چند افراد نے ابتدا میں ان کو کوئی بھی چیز لکھنے اور ریکارڈ کرنے کی اجازت نا دی۔ البتہ اعتماد بحال ہو جانے پر انٹرویو ریکارڈ کیے گئے۔

سوالنامہ

اس مرحلے میں انڈیپنڈنٹ لینڈ پاکستان کی جانب سے ۲ طرح کے سوالنامے بنائے گئے جن میں سے ایک تشدد سے متاثرہ افراد کے لیے تھا اور دوسرا ان کے لیے جنہیں تشدد پسند کہا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کے حالات اور معاملے کی حساسیت کو مدِ نظر رکھ کر انٹرویو کے لیے سوالات مرتب کیے گئے۔ فیلڈ ریسرچرز کو اس بات کی تلقین کی گئی کہ بات چیت کے دوران اگر وہ کوئی اضافی بات بتانا چاہیں تو ان کو ٹوکا نہ جائے۔ ایسے سوالات سے گریز کیا جائے جس سے ان کی حوصلہ شکنی ہو، اور ان کے نام اور مقامات کو صیغہِ راز میں رکھنے کی یقین دھانی کروائی جائے۔

گینگ کے گزشتہ ممبران تک رسائی

گینگ کے ممبران تک رسائی حاصل کرنا اور ان کے بارے میں معلومات لینا ایک مشکل کام تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی شناخت تبدیل کر کے ایسے مقامات پر منتقل ہو چکے ہیں جہاں ان کو کوئی نہیں جانتا۔ ان سے ان کی شناخت کا اعتراف کروانا اور ان کی معلومات کو صیغہ راز میں رکھنے کی یقین دہانی کروانا ایک مشکل کام تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہر آہٹ پر دھڑکا لگا رہتا ہے اور ہر ہاتھ ملانے والا دشمن ہی نظر آتا ہے ان کو اعتماد میں لینا بھی ایک صبر آزما مرحلہ تھا۔

تشدد سے متاثرہ افراد تک رسائی

ایک عام تاثر کے مطابق تشدد سے متاثرہ افراد کا انٹرویو لینا آسان تصور کیا جاتا ہے کہ شاید وہ اپنے ساتھ ہونے والے مظالم کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن ظلم سہنے کے بعد ان کے دلوں میں جو خوف اور بے اعتباری تھی اس کو بحال کرنے اور یقین دلانے میں تھوڑی تگ و دو کرنی پڑی تا کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی ظلم و زیادتی کو بلا خوف و جھجک بیان کر سکیں۔

ان سنی ان کہی

تشدد کی راہ اختیار کرنے والے نوجوانوں نے تشدد پسندانہ راہ اپنانے کی وجوہات پر روشنی ڈالی، جن میں طاقت کی ہوس، شناخت کی لالچ، شان و شوکت اور مال و دولت، انتقام کی آگ، نسلی اور لسانی تعصبات اور عدم انصاف شامل ہیں۔ تمام نوجوان اپنے اس افسوسناک اور شرمناک حقیقت اور اپنے ماضی پر نادم تھے۔ جنہوں نے پرتشدد واقعات کی راہ اپنائی ان کا کہنا تھا کہ وہ جس لالچ میں اس اندھے کنوئیں میں داخل ہوئے تھے اس میں انہوں نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان عوامل کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کی بدولت ان کو اس دلدل سے نکلنے کے مواقع میسر آئے۔

دوسری جانب وہ افراد تھے جو تشدد کا نشانہ بنے۔ زیادہ تر لوگ اپنے آپ کو بے یار و مددگار محسوس کر رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا قصوروار عدم انصاف کو ٹھہراتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر افراد کو یہ معلوم بھی نہ تھا کہ ان کا قصور کیا تھا جس کی وجہ سے ان کا مظالم سہنے پڑے اور زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔

کُل ۳۷ انٹرویوز سننے کے بعد ہم اُن مسائل کی نشاندہی کرنے میں کامیاب ہوئے جو نوجوانوں کو بغاوت کی جانب لے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تشدد کے شکار افراد کے انٹرویوز نے بہت سے سوالات اٹھائے جو ریاست، قانون اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کردار کے بارے میں تھے۔ انٹرویوز کی بنیاد پر مندرجہ ذیل عوامل سامنے آئے۔

- طاقت کی ہوس
- شناخت کی لالچ
- عیش و عشرت
- فرقہ واریت
- انتقام کی آگ/عدم انصاف
- بلیک آؤٹ

طاقت کی ہوس

انٹرویوز کو بنیاد بناتے ہوئے اور عام خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ تر نوجوانوں نے چھوٹی عمر میں ہی گینگ میں شمولیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ ایک اندازے کے مطابق گینگ کے ممبران پڑھے لکھے نہیں ہوتے یہی بات انٹرویو سے بھی ثابت ہو چکی ہے کہ زیادہ تر نوجوان اسکول کے زمانے ہی سے گینگ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ آئے دن اخبارات اور ٹیلی ویژن پر اِن نوجوانوں کی بتائی جانے والی کم عمریں سن کر یقین نہیں آتا کہ کوئی نوجوان اتنے سفاک

کاموں اور گھناؤنی کاروائیوں میں ملوث ہوسکتا ہے۔ لیکن انٹرویوز سے ظاہر ہے کہ یہ خبر ہی نہیں حقیقت ہے کہ گینگ سے وابستہ زیادہ تر نوجوان ۱۶ سے ۳۰ سال کی عمر کے ہیں۔ ان کا مقصد پیسے اور طاقت کا حصول ہے، اپنے اردگرد وہ جو ماحول دیکھتے ہیں آہستہ آہستہ اسی کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ جو نوجوان گینگ کے لیے کام کر رہے ہیں ان کا کام ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری، ڈکیتی، اغوا برائے تاوان، منشیات فروشی اور جوئے کے اڈے چلا کر پیسہ کمانا ہے۔ معصوم لوگ بھی تشدد کا نشانہ ان ہی وجوہات کی بناء پر بنتے ہیں۔ سابقہ گینگ ممبر مختار کا کہنا ہے کہ "تشدد ہی ہماری بنیاد ہے اگر ہم تشدد نہ کریں تو ہمیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ گینگ کسی علاقے میں قابض ہوتا ہی خوف کی وجہ سے ہے اور اگر ہم تشدد نہیں کریں گے تو ہماری بات کوئی نہیں سنے گا"۔

ان نوجوانوں کو طاقت کے نشے کے حصول نے اس بھنور میں دھکیل دیا ہے جہاں سے بچنا ان کے لیے موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ بھتہ خوروں، اور ٹارگٹ کلرز کی طاقت اور ان کی عیش وعشرت سے متاثر ہوتے تھے۔ علاقے کے لوگوں میں جو ڈر وخوف تھا اسے وہ عزت واحترام سمجھتے تھے۔ گینگ کا حصہ بننے کے بعد کچھ عرصے تک وہ اس نشے میں مخمور ہے، جب طاقت کا خمار اترا اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی، جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے ان کو چھڑوانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ حتیٰ کہ وہ بھی نہیں جن کے اشاروں پر ناچتے ہوئے جانے انہوں نے کتنے ہستے بستے گھروں کو موت کی وادیوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اگر کوئی ان کو تھامنے والا آیا تو وہ ان کا اپنا تھا۔ وہ اپنا جس سے انہوں نے سب کچھ چھپایا، افسوس کہ ان کو معلوم ہوا بھی تو آخر کب!

پرتشدد افراد کی داستانیں

بری صحبت

اس کول میں پڑھنے والا یہ نوجوان عبداللہ ۱۶ سال کی عمر میں گینگ کا حصہ بنا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے اسکول کے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک اسکوٹر چوری کیا اور اس کو بیچ کر اپنا شوق پورا کیا۔ اس کے بعد ان کی ہمت بڑھ گئی اور وہ گینگ میں شامل ہوتے چلے گئے۔ یہ نوجوان جس کا خیال ہے کہ "تشدد کرنا جائز ہے ،حق مانگنے سے نہیں ملتا چھیننا پڑتا ہے، اگر چھیننے پر بھی نہیں دے گا تو اس کو ماردیں گے۔ مارنا تو پڑتا ہے ناں، بغیر مارے اور ڈر کے تو کوئی نہیں دیتا"۔ آخر یہ نوجوان کس حق کی بات کر رہا ہے؟ کسی بے گناہ انسان سے اس کی حلال کی کمائی میں سے بھتہ وصول کرنا، کسی کی جان لینا اگر اس کا حق ہے تو اس کی جان پر آخر کس کا حق ہے؟ کاش! وہ یہ سوچ لیتا کہ جہاں وہ اپنے ناجائز حق کی بات کر رہا ہے وہاں اس کے کچھ فرائض بھی ہیں۔

کاش یہ نوجوان فلموں میں دکھائے جانے والے ڈاکوؤں اور گینگ ممبران کی دیدہ دلیری کے قصوں سے متاثر نہ ہوتا۔ یہ نوجوان اپنے ساتھ ہونے والے ایک واقعے کے بارے میں بتاتا ہے کہ "چھوٹا موٹا کام نکالنے کے لیے جب ہم نکلتے تھے تو پولیس کی چیکنگ ہوتی تھی چوکی پر، کبھی ہم ان سے لڑتے بھی تھے۔ ایک دفعہ چیکنگ میں میری جیب سے ٹی ٹی نکلا تو وہاں ہی سودا کر لیا ہم نے، اس کو پیسہ دیا اور ٹی ٹی بھی دی تو جیل تک نہیں گیا وہاں میری جان چھوٹ گئی"۔ گینگ کے کام کے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ "پیسہ اکٹھا کرنے کے لیے مختلف سسٹم ہوتے ہیں، جہاں گودام ہوتے ہیں، ملز ہوتی ہیں، سائیٹ ایریا ہوتے ہیں وہاں سے مہینہ لینا ہوتا ہے، جہاں بازار ہیں وہاں ہفتہ ہوتا ہے۔ کچھ لڑکے یہ پیسہ اکٹھا کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے لڑکے ہیں جو اس کام میں مر گئے، ان کے گھر والوں کی بھی مدد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھتہ لے لیا، اگر یہ نہیں ہوا تو کہیں اڈا کھلوا دیا چرس، افیم بکے اور جوا بھی ہوتا ہے ہمیں تو پیسہ چاہیے تو یہ سب ادھر سے ہی پورا ہوتا ہے"۔ لیکن گینگ سے واپس نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اس نے گینگ ایسے چھوڑا کہ "اپنا علاقہ چھوڑ دیا اور سب رابطے ختم کر دیے اب جہاں رہ رہا ہوں کوئی نہیں جانتا"۔

ہمیشہ سے ہی فلموں سے متاثر اس نوجوان کا کہنا ہے کہ "ہر چیز کا ایک اختتام ہوتا ہے جیسے فلم کا اختتام ہوتا ہے اسی طرح بس اب تھک گیا ہوں، بہت کام کیا ہے اب بس، وہ خواب تھا وہ میں بھول گیا ہوں۔ اب میں بہت دور آ گیا ہوں واپس کیوں جاؤں گا۔ اگر جاؤں گا تو ظلم کا بازار گرم ہو جائے گا دوبارہ اس لیے اب

واپس نہیں جانا چاہتا۔" سیاسی پارٹیوں کے حوالے سے اس نے کہا کہ "پارٹیوں کی وجہ سے ہی تو گینگ چل رہے ہیں، اگر پارٹی نہیں ہوتی تو گینگ کیسے چلتے، ہر پارٹی میں گینگ ہیں۔ وہ لوگ سرپرستی کرتے ہیں نوجوانوں کی، ایسے کام نہیں ہوتا۔ ہمارا نام استعمال کر کے ہی سیاسی پارٹیاں آگے جاتی ہیں جیسے ہم نے ایک علاقے پر قبضہ کیا تو اس علاقے کی سیاسی پارٹی کا دبدبہ ہوگا۔ سیاست اور گینگ لازم وملزوم ہیں"۔

خالد کی کہانی

خالد جس کی عمر سکول میں پڑھنے کی تھی وہ ۱۷۔۱۸ سال کی عمر میں گینگ وار کا ممبر بن گیا، وہاں اس کے دوست بننا شروع ہو گئے جن کے ساتھ مل کر اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا اور لوگوں سے پیسے وصول کرنے شروع کر دیے، پھر سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔ ایک دفعہ دوستوں کے ساتھ مل کر اس نوجوان نے ڈکیتی کا منصوبہ بنایا جو کامیاب نہ ہو سکا اور یہ نوجوان دو سال کے لیے جیل چلا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد خالد کی کاروائیوں میں تیزی آ گئی اور اس نے تشدد کرنا شروع کر دیا۔ خالد کے خیال میں "تشدد کرنا جائز نہیں ہے لیکن اپنے آپ کو بچانے کے لیے اور دوسروں سے کچھ چھیننے کے لیے تشدد کرنا ضروری ہے۔"

کاش جیل میں وقت گزارنے، بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان اور لوگوں کو مارنے پیٹنے کو وہ دلیری نہ سمجھتا۔ اس کو ایک دفعہ جیل جانے کے بعد یہ نصیحت ہو جاتی کہ وہ جس کام کی طرف جا رہا ہے وہ صرف ایک گڑھا ہے جس سے واپس نکلنا مشکل ہے۔ گینگ کے کام کے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے کہا "ہمارے بہت سے کام ہوتے ہیں جیسے کہ منشیات اور جوئے کے اڈے سنبھالنا اور بہت سے ایسے کام جو ہیں تو ناجائز لیکن گینگ میں رہ کر ان کو کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ "ان کاموں سے ہمیں پیسہ ملتا ہے جس کی وجہ سے اور بھی لڑکے گینگ میں شامل ہوتے ہیں"۔

اس کا کہنا ہے کہ یہ ایسا کام ہے جس میں پیسے ملتے تھے، ہمارا گزارہ بھی ہوتا تھا، لیکن گینگ سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ خاندان والوں کے سمجھانے پر کہ "اس طرح کے کام ہمارے خاندان والے نہیں کرتے جس طرح کے تم کر رہے ہو"۔ اس نے گھر چھوڑ دیا لیکن بعد میں خالد کو احساس ہوا کے اس طرح کے کام کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور یہ جو وقت اس نے برباد کیا ہے اس سے بہتر تھا کہ وہ سکول میں تعلیم حاصل کرتا۔ اس احساسِ جرم کی وجہ سے خالد نے گینگ چھوڑ دیا اور روپوش ہو کر زندگی گزارنے شروع کر دی۔ گینگ چھوڑنے کے بعد اس کے لیے ایک عام انسان کی طرح زندگی گزارنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ "سیاسی پارٹیاں گینگ کی سرپرستی کرتی ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کے بغیر گینگ نہیں چل سکتے۔ اغوا برائے تاوان، قبضہ مافیا، ان سب کاموں میں سیاسی جماعتوں کا بہت بڑا کردار ہے"۔

بروقت چھٹکارا

نثار منجو جب گینگ میں شامل ہوا تب اس کی عمر ۱۸ سال تھی۔ اس کا گھرانا خوش وخرم زندگی گزار رہا تھا، وہ اپنے چچا کے خاندان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ پھر اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور ساتھ ہی اس کے چچا کے خاندان کے رویوں میں تناؤ آنا شروع ہو گیا۔ ان کا رویہ نثار کے گھر والوں کے ساتھ برا ہوتا گیا اور ان کے لیے مسائل ہی مسائل پیدا ہونے لگے۔ اس زندگی سے تنگ آ کر انہوں نے یہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور نثار کی خالہ کی طرف چلے گئے۔ لیکن مہمان بھی آخر ایک دن وبالِ جان بن جاتا ہے، اس کی خالہ کے گھر والوں کے رویوں میں بھی تبدیلی آنے لگی۔

یہ نوجوان جس کے پڑھنے کے دن تھے گھر کے حالات سے تنگ آ کر گینگ میں شامل ہو گیا۔ نثار کے خیال میں "تشدد کرنا سو فیصد غلط ہے لیکن مجبوری میں ہر چیز جائز لگتی ہے"۔ گینگ کے کام کے بارے میں بتاتے ہوئے نثار کہتا ہے کہ "بھتے سے کام چلتا تھا، اس کو ایک جگہ دی گئی جہاں وہ چرس بیچتا تھا، جس سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی"۔ نثار بتاتا ہے کہ اس کی والدہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ گینگ میں شامل ہو گیا ہے اور وہ اس کو منع کرتی تھیں کہ ایسے کام چھوڑ دو لیکن اس نے ان کی بات نہ مانی۔ بعد میں والدہ کو پریشان اور بیمار دیکھتے ہوئے نثار کو احساس ہوا کے ایسے کام غلط ہیں اور "میں گینگ سے دور ہو گیا اور ابھی تک دور ہوں اور تھوڑا تھوڑا سامان بلوچستان لے کر جاتا ہوں اور وہاں بیچتا ہوں، جس سے گزارہ ہو جاتا ہے اور والدہ بھی خوش ہیں، اللہ کا شکر ہے کوئی پریشانی بھی نہیں ہے۔

"اس کا کہنا ہے کہ " پچھلی زندگی میں پیسے زیادہ تھے لیکن سکون نہیں تھا، لیکن اب بہت اچھی اور سکون کی زندگی گزار رہا ہوں اور اب رات کو بھی آرام سے نیند آجاتی ہے"۔

تشدد سے متاثرہ افراد کی کہانیاں

طاقت کے حصول کے لیے جو نوجوان گینگ کا حصہ بنتے ہیں ان میں سے بہت سے نوجوان اپنی دھاک بٹھانے کے لیے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت مندرجہ ذیل انٹرویو ہیں جن میں بے بس اور لاچار نوجوان تشدد کا نشانہ بنے۔ آیئے ان کی زندگی کی کہانیاں پڑھتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ گینگ کے ممبران نے ان کو اپنی طاقت دکھانے اور ان پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے کون کون سے حربے استعمال کیے ہیں۔

تشدد

الطاف ستار کہتا ہے کہ اس کو جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے کپڑے اتار کر وڈیوز بنائیں گئیں اور اب وہ اس قابل نہیں رہا کہ اس علاقے میں رہ سکے۔ اس کے ساتھ جو ہوا اس کی وجہ وہ بتاتا ہے کہ "علاقے میں جس گینگ کے لڑکوں کی ڈیوٹی لگتی تھی ان میں سے میری ایک سے نہیں بنتی تھی۔ اس نے اپنے لیڈر سے اس کی جھوٹی شکایت کر کے اس کا یہ حال کروایا"۔ اس نوجوان کو قانون سے بھی انصاف کی توقع نہیں ہے "پولیس چاہتی ہی نہیں ہے کہ تشدد کی کاروائیاں کم ہوں یا ان کے اوپر دباؤ آئے۔ جس کی وجہ سے وہ ان واقعات کو روکنے میں ناکام رہتی ہے"۔

گینگ میں ملوث تشدد پسند نوجوانوں کو آخر کس کی شے ہے کہ وہ سرِ عام کاروائیاں کرتے ہیں اور ان کو روکنے والا کوئی نہیں؟ الطاف کہتا ہے کہ ان نوجوانوں کو سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل ہے، یہ لوگ جارحانہ رویے اس لیے استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ لوگوں پر اپنی دھاک بٹھا سکیں۔ ہمارے نوجوان عدم برداشت کا شکار ہیں ہر کوئی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگا ہوا ہے اور جو یہ سب نہیں کر سکتا وہ ان لوگوں کے مظالم کا شکار ہو جاتا ہے۔ "ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنا کسی کو ذلیل کروانے کی خاطر اور نیچا دکھانے کی خاطر یہ سب کام کرنا"۔ اپنے علاقے کی پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے ان علاقوں کو بہتر کرنے کی توقع کرنا بے فائدہ ہے، اسکے خیال میں ان علاقوں میں بھی "سوات کی طرح کا آپریشن کیا جائے" ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر پولیس غیر جانبدار ہو جائے تو یہ پر تشدد واقعات ختم ہو سکتے ہیں۔

لیاری میں تصادم

جمال ننگی اور اس کا بھائی ایک فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ ایک دن ان کو فون آیا کہ مال لے جاؤ۔ وہ مال گاڑی میں رکھ ہی رہے تھے کہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ جمال کا بھائی اس میں لقمہ اجل بن گیا اور جمال کی ٹانگ پر گولی لگی۔ کوئی بھی ان کی مدد کو نہیں آیا سب اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے البتہ ایمبولینس آئی اور ان کو ہسپتال لے گئی۔ جمال پر اس سانحے کے بعد کیا گزری اسی سے پوچھتے ہیں، اس کا کہنا ہیکہ "ایک کمانے والا بھائی چلا گیا، میرا پاؤں ٹوٹ گیا اب اس میں راڈ ڈالا ہے۔ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا ہوں تو بچوں کی چیزوں کا ٹھیلا لگاتا ہوں۔ اسی سے گزارہ چل رہا ہے ۳ وقت کی روٹی مل رہی ہے"۔

جمال کے ان حالات کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیالات ہیں "یہ پر تشدد واقعات کبھی ختم نہیں ہوں گے، ہم یہاں خوف میں جیتے ہیں، کوئی گھر سے باہر نہیں نکلتا آئے دن فائرنگ ہوتی رہتی ہے"۔ اس کا کہنا ہے کہ لیاری کے برے حالات اور ان پُر تشدد واقعات کی وجہ بے روزگاری ہے۔ نوجوان لڑکوں کو کوئی کام نہیں ملتا لڑکے آوارہ گھومتے رہتے ہیں اور بعد میں اسلحہ لے کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

نامعلوم افراد

جو سلوک شاہ ویز کریم کے ساتھ ہوا اور جو کچھ اس نے گینگ کے درندوں کی قید میں رہتے ہوئے دیکھا وہ کسی درندگی سے کم نہیں۔ نہ جانے یہ نامعلوم لوگ، کسی

"اس کا کہنا ہے کہ " پچھلی زندگی میں پیسے زیادہ تھے لیکن سکون نہیں تھا، لیکن اب بہت اچھی اور سکون کی زندگی گزار رہا ہوں اور اب رات کو بھی آرام سے نیند آجاتی ہے"۔

تشدد سے متاثرہ افراد کی کہانیاں

طاقت کے حصول کے لیے جو نوجوان گینگ کا حصہ بنتے ہیں ان میں سے بہت سے نوجوان اپنی دھاک بٹھانے کے لیے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت مندرجہ ذیل انٹرویو ہیں جن میں بے بس اور لاچار نوجوان تشدد کا نشانہ بنے۔ آیئے ان کی زندگی کی کہانیاں پڑھتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ گینگ کے ممبران نے ان کو اپنی طاقت دکھانے اور ان پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے کون کون سے حربے استعمال کیے ہیں۔

تشدد

الطاف ستار کہتا ہے کہ اس کو جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے کپڑے اتار کر وڈیوز بنائیں گئیں اور اب وہ اس قابل نہیں رہا کہ اس علاقے میں رہ سکے۔ اس کے ساتھ جو ہوا اس کی وجہ وہ بتاتا ہے کہ "علاقے میں جس گینگ کے لڑکوں کی ڈیوٹی لگتی تھی ان میں سے میری ایک سے نہیں بنتی تھی۔ اس نے اپنے لیڈر سے اس کی جھوٹی شکایت کر کے اس کا یہ حال کروایا"۔ اس نوجوان کو قانون سے بھی انصاف کی توقع نہیں ہے "پولیس چاہتی ہی نہیں ہے کہ تشدد کی کاروائیاں کم ہوں یا ان کے اوپر دباؤ آئے۔ جس کی وجہ سے وہ ان واقعات کو روکنے میں ناکام رہتی ہے"۔

گینگ میں ملوث تشدد پسند نوجوانوں کو آخر کس کی شے ہے کہ وہ سرِ عام کاروائیاں کرتے ہیں اور ان کو روکنے والا کوئی نہیں؟ الطاف کہتا ہے کہ ان نوجوانوں کو سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل ہے، یہ لوگ جارحانہ رویے اس لیے استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ لوگوں پر اپنی دھاک بٹھا سکیں۔ ہمارے نوجوان عدم برداشت کا شکار ہیں ہر کوئی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگا ہوا ہے اور جو یہ سب نہیں کر سکتا وہ ان لوگوں کے مظالم کا شکار ہو جاتا ہے۔ "ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنا کسی کو ذلیل کروانے کی خاطر اور نیچا دکھانے کی خاطر یہ سب کام کرنا"۔ اپنے علاقے کی پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے ان علاقوں کو بہتر کرنے کی توقع کرنا بے فائدہ ہے، اسکے خیال میں ان علاقوں میں بھی "سوات کی طرح کا آپریشن کیا جائے" ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر پولیس غیر جانبدار ہو جائے تو یہ پر تشدد واقعات ختم ہو سکتے ہیں۔

لیاری میں تصادم

جمال جگسی اور اس کا بھائی ایک فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ ایک دن ان کو فون آیا کہ مال لے جاؤ۔ وہ مال گاڑی میں رکھ ہی رہے تھے کہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ جمال کا بھائی اس میں لقمہ اجل بن گیا اور جمال کی ٹانگ پر گولی لگی۔ کوئی بھی ان کی مدد کو نہیں آیا سب اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے البتہ ایمبولینس آئی اور ان کو ہسپتال لے گئی۔ جمال پر اس سانحے کے بعد کیا گزری اسی سے پوچھتے ہیں، اس کا کہنا ہے کہ "ایک کمانے والا بھائی چلا گیا، میرا پاؤں ٹوٹ گیا اب اس میں راڈ ڈالا ہے۔ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا ہوں تو بچوں کی چیزوں کا ٹھیلا لگاتا ہوں۔ اسی سے گزارہ چل رہا ہے ۳ وقت کی روٹی مل رہی ہے"۔

جمال کے ان حالات کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیالات ہیں " یہ پر تشدد واقعات کبھی ختم نہیں ہوں گے، ہم یہاں خوف میں جیتے ہیں، کوئی گھر سے باہر نہیں نکلتا آئے دن فائرنگ ہوتی رہتی ہے"۔ اس کا کہنا ہے کہ لیاری کے برے حالات اور ان پُر تشدد واقعات کی وجہ بے روزگاری ہے۔ نوجوان لڑکوں کو کوئی کام نہیں ملتا لڑکے آوارہ گھومتے رہتے ہیں اور بعد میں اسلحہ لے کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

نامعلوم افراد

جو سلوک شاہ ویز کریم کے ساتھ ہوا اور جو کچھ اس نے گینگ کے درندوں کی قید میں رہتے ہوئے دیکھا وہ کسی درندگی سے کم نہیں۔ نہ جانے یہ نامعلوم لوگ، کسی

نامعلوم مقام سے آکر نامعلوم کاروائیاں کر کے کس نامعلوم مقام کی جانب چلے جاتے ہیں؟ کہ ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے ان سے نامعلوم ہی رہ جاتے ہیں۔ شاہ ویز کریم کو بھی کچھ نامعلوم افراد نے پکڑا اور نامعلوم جگہ لے جا کر مارنے لگے، ۳ دن تک انہوں نے اس کو وہاں رکھا اور اس کے ہوتے ہوئے ہی ایک اور بندے کو لے آئے اور ان کی رحم دلی کی مثال یہ کہ انہوں نے اس سے پوچھا کہ اس کو مار پڑتے دیکھ سکتے ہو تو شاہ ویز کے ان کا رپر اس شخص کو الگ کمرے میں لے گئے اور شراب پی کر مارنے لگے۔ شاہ ویز کا کہنا ہے "وہاں اور لوگ بھی تھے۔ کسی کو مار رہے تھے، کاٹ رہے تھے، ذبح کر رہے تھے، کسی کو پنکھے سے لٹکا دیا۔ ایک بندے نے مجھے اسلحہ دیا کہ ان کو مارو، میں نے کہا کہ مجھے چلانا نہیں آتا۔ اس نے کہا کہ ہمارے ساتھ کام کرو، میں نے ان سے معافی مانگ لی"۔ اس پر جو ستم گزرے اس کے بارے میں اس نے بتایا کہ "میرا کان چیر دیا، کھانے میں بھی کچھ ملاتے تھے کہ میں بار بار گرتا تھا۔ گھر والے پریشان رہے، مالک بھی پریشان رہا، اب کام بھی نہیں رہا، مالک کو بھی دھمکی دی اور اس نے مجھے نکال دیا۔ مجھ سے بھی ۵ لاکھ مانگے تھے، میں نے کہا کہ میں غریب بندہ ہوں نہیں دے سکتا"۔ شاہ ویز کا بھتیجا بھی مچھر کالونی میں مارا جا چکا ہے۔ آخر ان افراد کے نامعلوم رہنے کی وجہ شاہ ویز نے بتا ہی دی اس نے کہا کہ "بے گناہ لوگوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور مارتے ہیں۔ ہمارے علاقے کے ہی لوگ ہیں جو یہ کام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر زبان کھولی تو مار دیں گے"۔

مجبوری

شبیر کے گھر کے پاس چرس کا اڈہ تھا، اس کے منع کرنے پر کہ وہ یہاں یہ کام نہ کریں اس کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ سارے محلے کے سامنے اس کو مارتے جاتے اور لوگوں کو ڈراتے کہ کوئی آگے آیا تو اس کو بھی گولی مار دیں گے۔ اس پر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں اس کی ٹانگ پر گولی لگی۔ وہ اس کو جان سے مار دینا چاہتے تھے لیکن اس کے گھر والوں کی منت کرنے پر اس کو ایک ہی گولی مار کے چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد اس کو کچھ پتہ نہیں کہ اس کے اور اس کے گھر والوں کے ساتھ کیا ہوا، وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

جب اُسے ہسپتال میں ہوش آیا تو اس کو بتایا گیا کہ اس کا آپریشن کر کے گولی نکال دی گئی ہے۔ شبیر بتاتا ہے کہ اس کا گھر تنگ ہے اور گرمیوں میں حبس اور گرمی برداشت نہ ہونے کی صورت میں جب بھی وہ گھر سے باہر آ کر بیٹھتا تو گینگ کے لوگ اس کو آ کر کہتے کہ " تمہیں بہت شوق تھا لالہ بننے کا اب دیکھ لیا لالہ بننے کا انجام؟ شکر کرو تمہیں قتل نہیں کیا اور تمہارا گھر نہیں جلایا"۔ اس کا پولیس کے بارے میں کہنا ہے کہ "پولیس تو یہاں آتی ہی نہیں ہے۔ نہ ہم نے یہاں کبھی پولیس موبائل دیکھی ہے۔ پولیس ان سے بھاگتی ہے اور ڈرتی ہے، تھانے میں رات کو تالا لگاتے ہیں"۔ وہ ان حالات کی وجہ بے روزگاری کو سمجھتا ہے۔ جو نوجوانوں کو اس کام کی طرف راغب کر رہی ہے۔

لوگوں کی زبان بند رہنے کی وجہ سے یہ لوگ نامعلوم رہتے ہیں، ہمارے قانون کے اندھا ہونے کی وجہ سے یا درج کی گئی رپورٹوں کو ردی کی ٹوکری کی نظر کر دینے کی وجہ سے۔ وجہ کوئی بھی ہو ریکارڈ کیے گئے انٹرویوز میں سے انصاف کسی کو بھی نہیں ملا۔

میری غلطی

عُزیر کے بھائی نے جب گینگ میں شمولیت اختیار کی تو اس کو اس کے گھر والوں نے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے باوجود گینگ میں شامل ہو گیا۔ ایک دن لیاری میں دو گروپوں کے درمیان تصادم ہوا جن میں سے ایک گینگ میں عُزیر کا بھائی بھی شامل تھا۔ اس کے گینگ کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے بعد اس کے بھائی کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اس بات کا علم مخالف گینگ کو ہونے پر گینگ کے لوگ ان کے گھر آئے اور ان کو گھر خالی کرنے کو کہا، ان سے بحث کرنے پر اس کو اور اس کے والد کو مارا پیٹا اور گھر کو خالی کرنے کا کہہ کر چلے گئے۔

اس کا کہنا ہے کہ اس واقعے کے بعد اس کو معاشی اور معاشرتی اعتبار سے دھچکا لگا ہے، راشن کی دوکان تھی جو چلی گئی۔ چند دوستوں کی منتیں کر کے دوکان بکوانے

میں کامیاب ہوا جس کے زیادہ پیسے تو نہیں ملے لیکن اتنے مل گئے کہ کہیں اور دوکان کھولی، جس پر زیادہ کام نہیں ہے مشکل سے گزارا ہو رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ رشتہ داروں اور ہمسائیوں نے ان کی مشکل وقت میں مدد کی اور ہسپتال کے اخراجات اٹھائے۔

پولیس سے توقعات کے بارے میں اس نے کہا" قانون نام کی چیز ہمارے ملک میں ہے ہی نہیں، جس کا زور ہے اس کا سکہ چلتا ہے، غریب آدمی پس کے رہ جاتا ہے۔ میں غریب آدمی ہوں میری فریاد کسی نے نہیں سنی میرے ساتھ کوئی انصاف نہیں ہوا، پولیس بھی ان سے ڈرتی ہے اور ان کو سپورٹ کرتی ہے۔ اگر میں جا کر رپورٹ کروں تو وہ ان کو خود بتا دیتے ہیں اس طرح میرے لیے مصیبت بن جاتی ہے، ہم بے بس ہیں کس سے فریاد کریں۔ پوری لیاری کو انہوں نے یرغمال بنایا ہوا ہے، جیسا وہ لوگ کہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے۔ تھانے اور علاقے والے ان ہی کی سنتے ہیں کوئی ان کے سامنے کچھ نہیں بول سکتا، اگر ان کو بند کیا جائے، منشیات اور جوا، شراب وغیرہ کو ختم کیا جائے تو ہمارا علاقہ سونا ہے۔ ہم رپورٹ لکھوانے جاتے ہیں تو ہمیں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کیوں آئے ہو آپکے علاقے میں تھانے بنے ہوئے ہیں ان کے پاس جاؤ ہم اب پولیس سے کیا توقع کریں۔ نہ جانے یہ کیسا وقت آ گیا ہے کہ لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے"۔

عزیر کا بھائی جس کی وجہ سے اس کے گھر والوں پر یہ مظالم ڈھائے گئے اس کا آج تک کوئی پتہ نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا۔

قانون اور کاروائی

۲۴ سالہ فقیر قدرت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا اور جو لوگ اس کو وہاں پھینک کر گئے تھے وہ اسے مردہ سمجھ چکے تھے۔ لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ " جسکو اللہ رکھے اس کو کون چکھے"۔ شام ۴ سے ۵ کا وقت تھا، شیر شاہ تھانے کے باہر گشت کرتے ہوئے رینجرز کو خون میں لت پت ایک شخص ملا جسکو انہوں نے ایمبولیس کروا کے شیر شاہ تھانے بھیجا اور تھانے والوں نے ہسپتال۔ اس شخص نے ۲ ماہ ۱۲ دن مختلف آزمائشوں میں گزارے۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے، منہ میں کپڑا ڈال کر تشدد کیا جاتا رہا، ناخن نکال دیے گئے، سینے پر گرم پانی ڈالا جاتا رہا۔ اس نے بتایا کہ " کوئی ایک ٹانگ پر تو دوسرا دوسری پر اور ایک ایک ہاتھ پر دوسرا دوسرے پر کھڑا ہو جاتا تھا، اس کو بے ہوشی کے انجیکشن دیے جاتے، وہ بے ہوش پڑا رہتا تھا، ۲۳ دن بعد ایک سوکھی روٹی دیتے"۔

آخر وہ ان کے چنگل سے آزاد ہو کر پولیس کے توسط سے ہسپتال پہنچا۔ علاج کے بعد اپنے بھائی کو بلایا اور ان پر ایف۔ آئی۔ آر درج کروائی چند نقاب پوشوں نے اس کو رات ۹ بجے ہوٹل جاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تو اس کے وجہ پوچھنے پر اس کو پستول دکھا کر زبردستی گاڑی میں دھکیل دیا گیا۔ جہاں تک وہ جگہ پہچان سکا وہ قدافی ٹاؤن تھا۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی اس کا سر نیچے کر کے اس کو پیٹا گیا اور سر نیچے رکھنے کو کہا گیا۔ آخر وہ اس انجان جگہ پہنچا جہاں ۳ مزید لوگ تھے۔ ان لوگوں نے کہا کہ اس سے کچھ بات کرنی ہے تو اس کے بات پوچھنے پر اس کو مارا گیا۔ اور پھر مظالم کا سلسلہ جاری رہا۔ قانونی کاروائی کے بعد بھی ظالم آزاد ہیں اور مظلوم کا کہنا ہے کہ "اس کو کسی بھی جھوٹے کیس میں پھنسوا دیتے ہیں، ابھی ۲ ماہ پہلے بھی میں لانڈھی جیل میں رہ کے آیا ہوں۔ ابھی بھی میں ان سے چھپ کے کراچی میں رہ رہا ہوں، اگر انہوں نے مجھے دیکھ لیا وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے"۔

اس سب کے باوجود وہ پُر امید ہے کہ قانون کی مدد سے مسئلے حل کیے جا سکتے ہیں، حالانکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "پولیس ان کے ساتھ خود ملوث ہوتی ہے۔ میرے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ میں باہر کھڑا ہوں اور مجرم اندر بیٹھ کے چائے پی رہے ہیں۔ پولیس کے ساتھ گیمیں مار رہے ہیں"۔ سیاسی پارٹیوں کے بارے میں بھی اس کے کچھ ایسے ہی خیالات ہیں کہ وہ ان کے ساتھ ملوث ہیں۔ اس کے خیال میں یہ سب صرف آرمی ختم کر سکتی ہے حکومت نہیں کیونکہ یہ ہی ان کے کھانے کے طریقے ہیں جو یہ سب ختم ہونے سے ختم ہو جائیں گے۔ اس شخص کا کاروبار ختم ہو گیا، ناخن نہیں ہیں اور جسمانی حالت نہایت افسوسناک ہو چکی ہے۔ اپنی اس حالت کے ذمہ دار وہ پیسے اور طاقت کے حصول کے ساتھ ساتھ ذاتی دشمنیوں کو بھی ٹھہراتا ہے۔ اس کا ان لوگوں کے لیے یہ پیغام ہے کہ جو لوگ یہ کام کر رہے ہیں ان کے اپنے بھی گھر بار ہیں وہ اچھے انسان بن کر زندگی گزاریں اور حکومت کراچی کو پر امن بنانے کے لیے کوئی اقدامات کرے۔

عدم برداشت

آج کل کے نوجوانوں میں برداشت کا مادہ کم ہوتا جارہا ہے۔ایک وہ زمانہ تھا جب محلے کا کوئی بزرگ کسی بری بات سے منع کرتا تو نوجوان اس کام کو ترک کر دیتے تھے،لیکن اب حالات اس کے متضاد ہو چکے ہیں۔شاہ جہاں ایک ۲۲ سالہ نوجوان ہے جس کی غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی عورت کو محلے کے لڑکے تنگ کریں۔اس کا کہنا ہے کہ " گینگ کے لڑکے راستے میں آتی جاتی عورتوں کو تنگ کرتے تھے۔منع کرنے پر پکڑ کے لے گئے اور بہت مارا جس کے نتیجے میں ۲ ماہ تک بستر پر پڑا رہا"۔

کیا محلے کی عورتوں کو تنگ کرنے کا مسئلہ صرف اس نوجوان کا تھا،جس کے منع کرنے پر اس کو یہ سزا ملی؟اور اس کے محلے کے باقی لوگ اس کو بچانے کے لیے بھی نہیں آئے۔اس نوجوان کو اس واقعے کے بعد معاشی اور معاشرتی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا" پہلے کام بھی کرتا تھا،سکون سے رہتا تھا۔اب کہیں آ جا بھی نہیں سکتا"۔اس واقعے نے اس نوجوان کو اس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے وہ نوجوان گزر چکے ہیں جو گینگ میں ملوث ہیں۔انتقام،بدلہ اور بے بسی کے ملے جلے اثرات کاش اس کو اس طرف نہ دھکیلیں جہاں سے گزر کر وہ تشدد پسند نوجوانوں میں جانا جانے لگے۔اس کا کہنا ہے "اگر موقع ملا تو میں بدلہ لوں گا بعد میں ،جو ہوگا دیکھا جائے گا"۔اس کے خیال میں گینگ میں شمولیت کی وجہ " صرف پیسہ ہے جن نوجوانوں کو پڑھنا چاہیے وہ گاڑیوں اور پیسوں کے چکر میں ان کاموں میں شامل ہو گئے ہیں"۔وہ اس بات سے انجان ہے کہ جس بدلے کی آگ میں وہ جل رہا ہے اکثر اوقات یہ ہی آگ نوجوانوں کو ان انجان راہوں کی طرف لے جاتی ہیں جہاں سے لوٹنا ناممکن ہے۔

یہ داستان تو یہاں ختم ہو گئی لیکن ایسی داستانوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ایک اور نوجوان کو ایسے ہی تشدد کا سامنا کرنا پڑا جو سکول کے سامنے سے گزرتے ہوئے نشے میں دھت لڑکوں کو لڑکیوں کو نہ چھیڑنے کی تلقین کر بیٹھا۔اس پر جو سانحہ گزرا وہ کچھ یوں ہے کہ لیاری میں سکول کے سامنے سے گینگ کے لڑکے جو نشے میں تھے لڑکیوں کو تنگ کر رہے تھے۔التمش بلوچ اور اس کے دوست کے منع کرنے پر ان کو گالیاں دیں اور مذمت کرنے پر فائرنگ شروع کر دی،اس نے بتایا کہ اس کے پاؤں پر گولیاں لگیں اور وہاں سے اس کو علاقے کے لڑکوں نے ہسپتال پہنچایا۔اس نے اس واقعے کے اپنی زندگی پر اثرات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ " مجھے معاشی اعتبار سے مشکلات کا سامنا ہے،میں سندھ گورنمنٹ پریس ڈپارٹمنٹ میں فٹبالر تھا،ڈسٹرکٹ ایسٹ میں بھی ۵ سال کیپٹن رہ چکا ہوں،کراچی کے بہترین کھلاڑیوں میں میرا شمار ہوتا تھا۔سکول اور کالج کی طرف سے کھیل کے میڈل اور ٹرافیاں اب بھی میرے پاس ہیں۔میرے والد مزدور ہیں،ہم نے ادھار لے کر پاؤں کا آپریشن کروایا،میرے پاؤں میں ابھی بھی راڈ ڈلا ہوا ہے۔میری نوکری بھی چلی گئی ہے"۔

اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس نے مزید کہا کہ "ہماری نوجوان نسل نشے اور پیسے کی لالچ میں تباہ ہو چکی ہے،تعلیم ختم ہوتی جارہی ہے اور برائیاں بڑھتی چلی جارہی ہیں۔اور ایک سب سے بڑی لعنت اسلحہ ہے جو کہ ان کی طاقت بنتا جارہا ہے"۔

بلاعنوان

اشتیاق حسین کارجحان اپنے علاقے میں فلاحی کاموں کی طرف تھا،وہ تعلیم کے حوالے سے ایک انجمن چلا رہا تھا اور اس کے علاوہ خواتین کے لیے سلائی کڑھائی کا مرکز بھی تھا۔لیکن اس ادارے کے پیچھے منشیات کا اڈا کھل گیا،کسی بزرگ نے اس کی شکایت کی تو سب کے مشترکہ فیصلے سے ۲ تھانوں بکرا پوری تھانے اور بغدادی تھانے میں درخواست دی گئی لیکن کوئی جوابی کاروائی نہ ہوئی"۔ایک دن رات کے وقت ان کے آفس پر فائرنگ کی گئی اشتیاق کا ایک رشتہ دار اس میں جاں بحق ہو گیا اور اشتیاق ۱۰ سے ۱۵ دن ہسپتال رہا اور اپنے رشتہ دار کے جنازے میں بھی شرکت نا کر سکا۔

ان کی درج کی گئی رپورٹ اور اس حملے کے بعد پولیس کاروائی کا بتاتے ہوئے اشتیاق نے کہا کہ "اس کے بعد بھی پولیس نے مدد نہیں کی،جب ہم پر گولیاں چلیں تو پولیس آئی اپنی کاروائی کی اور چلی گئی،اس کے بعد کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ہمارے علاقے میں ۲ منشیات کے اڈے کھلے ہیں (ہاں لیکن یہ ضرور ہوا کہ

فلاحی کام کرنے والی انجمن بند ہوگئی) اور جنہوں نے حملہ کیا تھا وہ سرِ عام پھر رہے ہیں۔ علاقے والوں نے اتنی مدد ضرور کی تھی کہ وہ اٹھا کے ہسپتال لے گئے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ گینگ کے لوگ اس بے روزگاری کے دور میں جب نئی گاڑیاں، بائیک اور موبائل لے کر پھرتے ہیں، نئے ڈیزائن والے کپڑے پہنتے ہیں تو غریب لوگ ان سے متاثر ہو کر ان کے پاس چلے جاتے ہیں۔ پیسے کے لیے غریب لوگوں کو مارتے ہیں اور پھر خود بھی اپنوں کے ہی ہاتھوں مارے جاتے ہیں اور ان کو اس مقام تک پہنچانے والے لوگ بھاگ جاتے ہیں۔

جائیں تو جائیں کہاں

مدد ساندو ۲۰۰۰ روپے ہر ہفتے بھتے کی صورت میں گینگ والوں کو دیتا تھا۔ تین ہفتے کاروبار میں پریشانی رہی جس کی وجہ سے وہ بھتہ نہیں دے سکا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گینگ کے لوگ اس کو اٹھا کے لے گئے اور اپنے مالک کے سامنے بیٹھا دیا، وہ اس کو مارتے تھے اور کہتے تھے کہ تم پیسے کیوں نہیں ادا کرتے؟ وہ بتاتا ہے کہ " تین چار گھنٹے تک رکھا اور ظلم کرتے رہے جب بہن بہنوئی آئے اور انھوں نے کہا کہ یہ پیسے ادا کر دے گا تب انھوں نے مجھے چھوڑ دیا"۔

مدد پر اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اس کا کاروبار ختم ہو چکا ہے، اور وہ دیہاڑی پر کام کرنے پر مجبور ہے۔ اپنے بھائی کے بارے میں مدد ساندو بتاتا ہے کہ "وہ بھی گینگ کے ساتھ شامل تھا لیکن کسی اختلاف کی وجہ سے اس کو انکاؤنٹر میں مروا دیا گیا۔ جس کی وجہ سے ہم نے علاقہ چھوڑ دیا اور لیاری میں رہنا شروع کر دیا"۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ گینگ میں لوگ اس لیے شامل ہوتے ہیں کیونکہ لڑکوں کو آزادی، گاڑی اور پیسہ ملتا ہے اور وہ اپنی طاقت پر فخر کرتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو یہ نہیں پتہ ہوتا کہ جس انجام کو مدد کا بھائی پہنچا ان کا بھی یہ ہی انجام ہو سکتا ہے۔ مدد کہتا ہے کہ وہ " قانونی کاروائی کرنا چاہتا تھا لیکن گھر والوں نے منع کر دیا ہے" ۔ وہ بھی یہ ہی کہتا ہے کہ ہماری حکومت کو ذمہ داری لینی چاہیے اور ان علاقوں کے حالات بہتر بنانے کے لیے اقدامات کرنے چاہیں۔ اپنے علاقوں کی سیاسی پارٹیوں سے تو ان لوگوں کو کوئی بھی امید نہیں ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کے علاقوں میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس میں سیاسی پارٹیاں ہی ملوث ہیں۔ ہر ایک پارٹی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگی ہوئی ہے۔

بدلہ

مغیز ایک ٹرک ڈرائیور ہے۔ ایک دن جب وہ پشاور سے آ رہا تھا تو چند لڑکے آئے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کے اُسے کہیں لے گئے۔ وہاں لے جا کر اس کو بہت مارا اور تشدد کیا۔ اسے ایک سیاسی پارٹی کا کارکن کہتے اور اس کو پٹھان کہہ کر تشدد کرتے جاتے۔ اس نے کہا کہ نہ میں سیاست سے تعلق رکھتا ہوں نہ ہی پٹھان ہوں۔ ایک دن ان کو خود ہی ترس آ گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پھینک گئے۔ آنکھوں پر بھی پٹی تھی وہ چلتا جاتا اور مدد کے لیے پکارتا جاتا، آخر اس کو وہ لوگ ملے جنہوں نے اس کو کرایہ دے کر گھر بھیجا۔ ان ۶ دنوں میں جن میں وہ تشدد کا نشانہ بنتا رہا اس کے گھر والوں کو یہ ہی علم تھا کہ وہ کام کے سلسلے میں گیا ہوا ہے۔ لیکن موبائل نمبر نہ ملنے پر وہ تھوڑے پریشان بھی تھے۔

پولیس کو اِس تشدد واقعے کی رپورٹ درج کروانے کے بارے میں مغیز کہتا ہے کہ "پولیس ان لوگوں کے ساتھ خود ملی ہوئی ہے، وہ خود تشدد کرتے ہیں۔ میں پولیس کے پاس گیا تو انہوں نے کہا شکر ادا کرو کہ تمہاری جان بچ گئی ہے، تم ان چکروں میں نہیں پڑو۔ میں پھر ایف۔ آئی۔ آر کیسے کٹواتا، یہاں پولیس ہی ظالم ہے"۔ اس نوجوان کے دل میں ان لوگوں کے لیے انتقام کی آگ جل رہی ہے، یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے جب کسی کو انصاف نہ ملے، بالآخر وہ دوسرے راستے اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور اس کے بھی کچھ ایسے ہی خیالات ہیں۔ ''میں بدلہ لوں گا، اگر وہ مجھے مل جائیں تو میں بھی اُن پر تشدد کروں گا۔ کیونکہ انہوں نے مجھے بہت مارا ہے۔ میری کمر پر اب بھی نشان ہیں۔ مجھ سے بیٹھا بھی نہیں جاتا۔ میں ڈرائیور ہوں، مجھے بہت مسئلہ ہوتا ہے بیٹھنے میں، ابھی بھی درد ہے مجھے۔ اگر مجھے مل جائیں تو میں نہیں چھوڑوں گا انہیں۔ اگر گولی بھی ماری تو میں بھی کھا لوں گا، لیکن چھوڑوں گا نہیں"۔ اس نوجوان کا خیال ہے کہ ہم سیاسی پارٹیوں کا نشانہ بن رہے ہیں اور فرقہ پرستی میں بٹ گئے ہیں۔ اس لیے ہمارا یہ حال ہے کہ ہمارے ساتھ جو چاہے کوئی سلوک کرے ہمیں اس کو خاموشی سے سہنا پڑتا ہے۔

پہچان کی لالچ

پہچان اور اختیارات کی لالچ بھی اہم عوامل جو ایک نوجوان کو تشدد کا راستہ اختیار کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ نوجوانوں کو اپنی دھاک بٹھانے اور اسلحے کے زور پر اپنی بات منوانے کا نشہ اس پیشے کی طرف راغب کرتا ہے۔ پہچان ایک ایسا نشہ ہے جو ہر فرد کی فطری خواہش ہے۔ دورِ حاضر میں لوگ اپنی پہچان شناخت کے لیے بہت سے طریقے اپناتے ہیں۔ ہر پیشے سے وابستہ افراد اپنی صلاحیت کے مطابق مختلف طریقے اپنا کر اپنی پہچان بنانے کی ریس میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ ایسے طریقے بھی ہیں جنہیں اپنانے سے انسان پہچان تو بنا لیتا ہے لیکن وہ پہچان نہیں رہتی بدنامی بن جاتی ہے۔ جب انسان اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ناجائز طریقہ کار اپناتا ہے تو وہ اس کے گلے کا طوق بن جاتا ہے۔ یہ ہی وہ پہچان ہے جسے ہم گینگسٹرز کی یا ان لوگوں کی پہچان کہہ سکتے ہیں جنہوں نے اپنی دھاک بٹھانے کے کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے جو خوف ہے وہ اس کو اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں لوگ ان کی عزت کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا سلام کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے تشدد سے تنگ لوگ اپنی زندگیاں بچانے اور تشدد سے بچنے کے لیے ان کی عزت کرنے پر مجبور ہیں۔

لوگ یہ سب کرنے پر مجبور ہیں اور خوف کے باعث کسی میں یہ ہمت نہیں کہ ان کے مظالم کے خلاف آواز اٹھا سکے۔ چند انٹرویوز میں ہمیں یہ معلوم ہوا کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بھی جرات نہیں کہ وہ ان کے تشدد کو روک سکیں۔ تشدد کی راہ اختیار کرنے والے نوجوانوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو غیر تعلیم یافتہ ہیں یا جو اِس جھوٹی شناخت کے پیچھے تعلیم کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔ یہ بھٹکے ہوئے نوجوان اُن لوگوں سے متاثر ہیں جو اسلحے کے زور پر دوکانیں بند کرواتے ہیں اور جس دوکان سے چاہیں بغیر پیسے دیے کھا پی لیتے ہیں۔

ان تشدد پسند افراد کی سچی کہانیاں ملاحظہ فرمایئے۔

طاقت کا حصول

محمد نور اپنے علاقے کے اُن لڑکوں سے متاثر ہوا جو گینگ کے لیے کام کرتے تھے۔ جن کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ "اکثر ہم اپنے علاقے میں دیکھتے تھے کہ اچانک حالات خراب ہو گئے ہیں اور لوگ اپنے گھروں کی طرف بھاگ رہے ہیں، ۱۷۔۱۸ سال کی عمروں کے نوجوان اسلحے کے زور پر دوکانیں بند کروا رہے ہیں۔ لوگ ان سے ڈرتے تھے، ہم خود بھی ان سے ڈرتے اور بھاگ جاتے تھے"۔

نور کو بھی تجسس ہوا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں جو سب ان سے ڈرتے ہیں؟ آخر کار وہ ان سے ملا اور یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب اُن کو نور پر اعتبار ہو گیا اور انہوں نے نور کے ہاتھ میں اسلحہ تھما دیا۔ اب تو اس کو یہ کام اور زیادہ اچھا لگنے لگا اور وہ بھی لوگوں کو ڈرانے دھمکانے لگا۔ لیکن لوگوں کو ڈرانے دھمکانے والے اِس نوجوان نے کہا کہ "اب مجھے اِس کام سے ڈر لگتا ہے اگر کوئی بلاتا بھی ہے تو میں جان چھڑوانے کی کوشش کرتا ہوں، اب میں نے شادی کر لی ہے، ۲ بچے بھی ہیں، اب میں سوچتا ہوں کہ اگر میرے بچوں کے ساتھ یا میرے کسی دوست کے ساتھ بھی ایسا ہو تو کیسا ہوگا؟ اب احساس ہوتا ہے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا؟"۔ اس نے مزید بتایا کہ اس کے گھر والوں کو اس کام کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا وہ یہ کام چھپ کر کرتا تھا۔

اُس نے اپنی پہلی ٹارگٹ کلنگ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ "ایک دن میرے استاد نے مجھے بائیک چلاتے ہوئے دیکھا اور کہا کہ تم بائیک بہت اچھا چلاتے ہو مجھے کل ملنا۔ دوسرے دن جب میں وہاں گیا تو اُس نے مجھے کہا کہ بائیک نکالو ہمیں کہیں جانا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اُس نے مجھے کہا کہ بائیک تیار رکھنا۔ ایک جگہ کھڑے شخص کو گولی ماری اور کہا کہ بائیک بھگانا شروع کر دو۔ میں نے بائیک بھگانا شروع کیا اور بالآخر ہم اپنے یونٹ کے اندر آ گئے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کون تھا کس نے مارا اور کیوں مارا۔ اس دن یہ کام کر کے مجھے ڈر محسوس ہوا، لیکن جب اُس نے مجھے ڈرتے ہوئے دیکھا تو تسلی دی کہ اگر ڈرو گے تو لوگوں پر رعب کیسے جماؤ گے۔

اس دھندے میں کوئی کسی کا سگا نہیں آج آپ جس کے اشاروں پر کام کر رہے ہیں کل ہوسکتا ہے کہ اُسی کو موت کی گھاٹ اتارنے کا حکم مل جائے۔ کبھی آپ کسی کی مخبری کر رہے ہوتے ہیں تو کبھی کوئی آپکی، ہر وقت ایک دھڑکا لگا رہتا ہے کب کون گولی کا نشانہ بن جائے یا کب کہیں آپ کسی کا نشانہ بن جائیں۔

انجام

۱۹ سالہ جاوید نسیم روزانہ گلی میں دیکھتا کہ گینگ کے لڑکوں کو ہر کوئی سلام کرتا ہے۔ وہ جس دکان پر بھی وہ جاتے، کچھ بھی کھاتے، لیکن پیسے نہیں دیتے تھے۔ وہ اُن کے پیسے اور عیش عشرت سے متاثر ہو گیا اور اُس نے اُن سے دوستی کر لی۔ انہوں نے بھی جاوید کو چھوٹے موٹے کام دینا شروع کر دیے اور اس طرح جاوید گینگ کا حصہ بن گیا۔ جاوید کا گینگ میں آنے کا مقصد صرف پیسے اور طاقت کا حصول تھا۔ جاوید بتاتا ہے کہ "وہ مجھ سے چھوٹے موٹے کام کرواتے تھے۔ پانچ سے چھے بندوں کا گروپ ہوتا ہے، ان کے اوپر ایک ہیڈ ہوتا ہے، جو آرڈر دیتا ہے، پھر وہ آرڈر ہمیں ملتا ہے کہ یہ کام کرنا ہے اور اس طرح پوری ٹیم چلتی ہے"۔

" گھر والوں کو گینگ میں شمولیت کے بارے میں اُس وقت پتہ چلا جب مجھے پولیس پکڑ کر لے گئی اور تین دن کے بعد میری ضمانت ہوئی"۔ جاوید کی بیداری میں اُس کے گھر والوں کا بہت ہاتھ ہے، انہوں نے ہی اِسکی ضمانت بھی کروائی۔ "اس کے بعد مجھے احساس ہوا کہ جو کام میں کر رہا ہوں وہ غلط ہے۔ گھر والے بھی پریشان ہیں، اسی وجہ سے میں نے گروپ چھوڑ دیا"۔ سیاسی جماعتوں کے بارے میں جاوید کہتا ہے کہ "ان جماعتوں کا پُر تشدد واقعات میں نہایت اہم کردار ہے، ان میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو پیسہ کمانے کے لیے بھتہ وصول کرتے ہیں"۔ لیکن اب گروپ چھوڑنے کے بعد اس کو مشکلات کا سامنا ہے کیونکہ اگر گروپ کے لوگوں نے اُسے پکڑ لیا تو وہ اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ معصوم لوگوں کی جان لینے والے لوگوں کو اپنی جانیں کتنی پیاری ہوتیں ہیں۔

عیش وعشرت کی زندگی

طاقت کی ہوس اور پہچان کی لالچ کے علاوہ ایک اور عنصر بھی ہے جو گینگ میں شمولیت اختیار کرنے والے نوجوانوں سے منسوب ہے۔ وہ ہے عیش وعشرت کی زندگی گزارنا۔ تشدد کی راہ اختیار کرنے والے نوجوانوں نے بتایا کہ اُن کو گینگ کے ممبران کی گاڑیاں، نئے کپڑے، مال اور دولت نے یہ راہ اپنانے پر مجبور کیا۔ گینگ اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے مالی طور پر خوشحال ہیں۔ یہ گینگ غیر قانونی کاموں جیسے بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان، جوئے اور منشیات کے اڈے وغیرہ، سے خُوب پیسہ کماتے ہیں۔ اسی وجہ سے گینگ کے نوجوان قیمتی کپڑے پہنتے ہیں اور نئی گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔

نوجوانوں کی گینگ میں شامل ہونے کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیچھے بھی یہ ہی عوامل کارفرما ہیں۔ ایک سابقہ گینگ ممبر ذیشان کے مطابق "بے روزگار نوجوان ہمارے پاس آتے ہیں، ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، چائے پانی پیتے ہیں اور ہم سے متاثر ہو کر گینگ میں شامل ہو جاتے ہیں"۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جو نوجوان گینگ کے لوگوں کی عیش وعشرت سے متاثر ہوتے ہیں ان میں زیادہ تعداد ان نوجوانوں کی ہے جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاید وہ یہ حقیقت بُھلائے بیٹھے ہیں کہ "ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی"۔ وہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ رہے ہیں، انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ اِس تصویر کا دوسرا رخ کتنا تاریک ہے۔ اُن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اِس کالے دھندے سے چھٹکارا حاصل کرنا اُن کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ایک نوجوان نے اپنی زندگی کی کہانی سناتے ہوئے کہا کہ " گینگ میں تو بہت موج ہے، گاڑی پیسہ سب کچھ ہے، لیکن سکون نہیں ہے، رات کو نیند نہیں آتی، ہر وقت خوف رہتا ہے"۔

خدا نہ کرے اگر اب ان کا سامنا اُن لوگوں سے ہو جائے جن پر وہ مظالم ڈھاتے رہے ہیں۔ کیا وہ انہیں معاف کر دیں گے؟ ہاں اگر کر بھی دیں گے تو انہیں اُن لوگوں سے کون معافی دلوائے گا جنہیں یہ ہمیشہ کی نیند سلا چکے ہیں؟

جس طرح گینگ کے ممبر ہونے کی حیثیت سے اُن کے چنگل سے نکلنا ایک عام آدمی کے لیے مشکل کام ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کب وقت ان کو بھی اس

دوراہے پر لا کھڑا کرے گا۔ گینگ چھوڑنے کے بعد شاید چھپ کر زندگی گزارنا آسان ہو، لیکن حافظے میں محفوظ ماضی کی یادوں سے پیچھا چھڑانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ جس طرح وہ کبھی کسی کے لیے موت کا سایہ بن کر اُس کے سر پر منڈلاتے تھے وہی موت کے سائے گینگ چھوڑنے کے بعد اِن کی زندگی میں دھڑکا بنے رہتے ہیں۔ ایک نوجوان نے بتایا کہ "جو بھی گروپ کا ممبر بن جاتا ہے اُس کے پاس گروپ کے راز ہوتے ہیں اس لیے راضی خوشی گروپ چھوڑنے نہیں دیا جاتا، اگر چھوڑنا ہے تو شہر یا ملک چھوڑو، تب ممکن ہے"۔

مندرجہ ذیل کہانیاں اُن گینگ ممبران کی ہیں جنہوں نے عیش وعشرت کی زندگی سے متاثر ہوکر گینگ میں شمولیت حاصل کی۔

فراغت

۲۳ سالہ عاطف نے ۱۷ سال کی عمر میں گینگ میں شمولیت اختیار کی، اس کا کام ناکے پر بیٹھنا اور آنے جانے والوں پر نظر رکھنا تھا۔ اس کو اس کام کی طرف راغب کرنے والے اس کے اپنے دوست ہی تھے، جنہوں نے اسے فارغ دیکھ کر یہ پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ عاطف کو بھی ان تمام کاموں میں مزہ آنے لگا، پیسے، طاقت، اسلحہ چلانا، بھتہ لینا، پرچیاں دینا اور مار پیٹ کرنا اُس کے لیے ایک پرلطف کام بن گیا تھا۔

اُس کی آنکھوں پر بندھی پٹی اُس وقت کھلی جب اُسے اسلحہ رکھنے کی وجہ سے جیل جانا پڑا اور ۲ ماہ جیل ہوئی۔ تب بھی اُس کا ہاتھ تھامنے والے اُس کے اپنے ہی تھے۔ اس سے جب یہ پوچھا گیا کہ اس کا تشدد کے بارے میں کیا خیال ہے تو اس نے کہا کہ " تشدد کرنا تو جائز نہیں ہے۔ بلاوجہ کسی کی آہیں لینا غلط ہے۔ اُس وقت ہماری مجبوری تھی اگر میں نہیں کرتا تو مجھے مار دیا جاتا۔ اس لیے یہ سب کرتا تھا، مجھے نہیں پتہ ہوتا تھا کہ اگلا بندہ کون ہے، کیا ہے جس کو ہم مار رہے ہیں"۔

وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ وہ زیادہ آگے نہیں گیا اور بروقت اس کو عقل آ گئی۔ اس کام کی مثال وہ ایک اندھے کنوئیں سی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "ایک دفعہ آپ کنوئیں میں گر جائیں تو آپ نکل نہیں سکتے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ آپ ایک دفعہ آ جائیں تو نکل نہیں سکتے۔ میرے پر تو اللہ کا کرم ہے اور ماں باپ کی دعائیں ہیں ورنہ یہاں سے باہر جانے کا کوئی بھی راستہ نہیں ہے کیونکہ اتنے کام کیے ہوتے ہیں کہ ان کو ڈر رہتا ہے کہ راز نہ کھل جائیں۔ وہ ہمیں مار بھی سکتے ہیں، بس ڈر کر زندگی گزار رہے ہیں"۔

اس کا کہنا ہے کہ اگر اس کے گھر والے اس کا ساتھ نہ دیتے تو آج وہ زندہ سلامت نہ ہوتا۔ وہ گینگ میں شامل ہونے والے لڑکوں کو پیغام دینا چاہتا ہے کہ " آپ کے سامنے اتنے تجربات ہو چکے ہیں اور آپکو پتہ ہے کہ آپکے سامنے گڑھا ہے، آپ وہاں جائیں گے تو اس میں گریں گے۔ آپ اس سے خود ہی بچ سکتے ہو کوئی اور آپکو نہیں بچا سکتا، مہربانی کر کر ایسی تنظیموں کا ساتھ نہ دیں، اپنے کام سے کام رکھیں اور اپنے گھر والوں کو وقت دیں"۔

بے روزگاری

۲۳ سالہ ذیشان گھر کی مالی مشکلات اور بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور ہوکر اِس دلدل میں آ پھنسا۔ وہ اُس وقت محض ۲۰ سال کا تھا۔ اس کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ غلط کام میں پھنس گیا ہے، اُس نے کہا کہ " تشدد جائز تو نہیں ہے مگر گینگ کا حصہ ہونے کی وجہ سے لیڈر کی بات تو ماننی پڑتی ہے"۔ اس کے گھر والوں کو علم ہوا تو انہوں نے اس کو سمجھایا، لیکن اس کا کہنا ہے کہ وہ مجبور تھا۔

ایسا کام کرنے والوں کے پیچھے مضبوط ہاتھ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن کو پولیس پکڑتی نہیں ہے اس نے بتایا کہ میں ایک دو بار چھوٹے کیسوں میں پکڑا گیا تھا، لیکن تھانے سے ہی ضمانت ہوگئی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کام میں سیاسی پارٹیوں اور معمولی پولیس اہلکاروں سے بڑھ کر کسی کا ہاتھ ہے، جس کی وجہ سے پولیس ان کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس نے گینگ میں شامل ہونے والے نوجوانوں کے بارے میں بتایا کہ "جن بچوں کے پاس تعلیم اور روزگار نہیں ہوتا، وہ ہمارے پاس آ کر بیٹھتے ہیں، ہمارے ساتھ چائے، پانی وغیرہ پیتے ہیں۔ اگر ان کا رجحان ہماری طرف ہو یا پھر کئی دفعہ ہم خود دعوت دیتے ہیں، کہ کوئی لڑکا

ہمارے کام آ سکتا ہے۔ پھر وہ اپنی مرضی سے گینگ میں شمولیت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اِس دلدل میں پھنسنے کے بعد اُن کو یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ گینگ چھوڑ سکیں، میں بھی اب چھپ کر رہ رہا ہوں۔

چھٹکارا

سکول کا طالب علم شاہ محمد ۱۷ سال کی عمر میں دوستوں کے ساتھ مل کے گینگ میں شامل ہو گیا اور بائیک چوری کرنے سے اس نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ اسنے بتایا کہ "بائیک چوری کر کے لیڈر کو بائیک دیتے تھے جس کے دو ہزار روپے ملتے تھے"۔ اس کے بعد وہ اس دلدل میں دھنستا چلا گیا اور اس نے گلیوں میں منشیات فروشی کا کام شروع کر دیا۔ اس نوجوان کا کہنا ہے کہ اس نے گینگ میں شمولیت اس لیے اختیار کی کہ وہ پیسے کما سکے کیونکہ اس کے والد نہیں ہیں اور والدہ بہت بوڑھی ہیں۔ اِس نوجوان نے گینگ میں بندوق چلانا بھی سیکھا، ٹی ٹی کس طرح چلاتے ہیں وہ بھی سیکھا۔ پولیس نے بھی دو دفع پکڑا، لیکن لیڈر آ کر چھڑوا دیتا تھا۔

کاش یہ نوجوان ٹی ٹی چلانے پر اور پولیس سے پکڑے جانے پر اتنا فخر نہ محسوس کرتا اور ان کاموں کی جگہ کوئی ایسا کام کرتا جس سے اس کو بھی فائدہ ہوتا اور اس کے گھر والوں کو بھی شرمندگی نہ ہوتی۔ وہ بتاتا ہے کہ پہلے تو اس کے گھر والوں کو اس کی گینگ میں شمولیت کا نہیں پتہ تھا لیکن جب معلوم ہوا تو بھائیوں نے بہت مارا اور منع کیا۔ اس وقت اس کو ایسا لگا کہ اب واپسی کی راہ ممکن نہیں ہے۔ وہ گھر سے بھاگ گیا اور کچھ لڑکوں کے ساتھ کوارٹر میں رہنا شروع کر دیا۔

گینگ کے کام کے بارے میں بتاتے ہوئے اُس نے کہا کہ گینگ کے لیڈر کے پاس ایک بندہ آتا تھا، جس کی وہ بہت عزت کرتا تھا، اس کو پانی اور شراب پلاتا تھا ، پھر شاہ محمد کو معلوم ہوا کہ یہ اس کے گینگ کے لیڈر کو آرڈر دیتا ہے۔ شاہ محمد بتاتا ہے کہ بھرتیوں کے سلسلے میں یہ چیز دیکھی جاتی تھی کہ "لڑکا بہادر ہو، کسی کے مارنے یا دھمکانے سے یا پھر جیل جانے سے ڈرتا نہ ہو اور نا ہی کسی کے پریشر میں آتا ہو"۔

اُس نے گینگ ایسے چھوڑا کہ "اس کے ساتھ کے تین چار لڑکوں کو اس کے سامنے مار دیا گیا اور اتنی بری طرح مارا گیا کہ کسی کا سر پھاڑ دیا، کسی کی آنکھ نکال دی ، جس کی وجہ سے اُس نے سوچا کہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے اور پھر شاہ محمد نے گینگ میں جانا کم کر دیا اور پھر گھر والوں سمیت لیاری چھوڑ دیا۔ اس نوجوان کا یہی کہنا ہے کہ ایسے کاموں میں برائی ہے اور ان کاموں سے دور رہنا چاہیے"۔

پسِ پردہ قوتیں

کامران نجف ۲۰ سال کی عمر میں گینگ کا حصہ بنا۔ گینگ میں شمولیت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے ایک دوست سے متاثر تھا جو ایک گینگ کے لیے کام کرتا تھا۔ اس کے گینگ میں کم سے کم چالیس لوگ تھے اور گینگ کا ایک لیڈر بھی تھا۔ کامران نے دو بینک لوٹے "جس سے ۵۰ لاکھ بنے اور پھر وہ سب میں تقسیم ہوئے جس میں سے مجھے پانچ لاکھ ملے"۔ اِس گناہ کے بعد اس نے ایک اور گناہ یہ کیا کہ اپنی والدہ کو جھوٹ بتایا کہ "میں نے پرائز بانڈ جیتا ہے جس کا اُن کو یقین ہو گیا"۔ وہ اپنے گھر والوں کے پوچھنے پر ان کو یہ ہی بتاتا کہ وہ مزدوری کرتا ہے اور اسی سلسلے میں کام کے لیے جاتا ہے۔

کامران کا کہنا ہے کہ "سیاسی پارٹیاں گینگ کے پسِ پردہ ہوتیں ہیں، جتنے منظم طریقے سے گینگ کارروائیاں کرتے ہیں ان کے پیچھے ایک بڑی طاقت ہوتی ہے جو ان سے یہ کام کرواتی ہے"۔ اس نے کہا کہ گروپ چھوڑنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا لیکن اس کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ غلط کام کر رہا ہے، جس کی وجہ سے اس نے اپنے خاندان کو ایک محفوظ جگہ منتقل کیا اور کچھ عرصے کے لیے دبئی چلا گیا اور "اب چار سال کے بعد واپس آیا ہوں"۔ اب وہ سکون کی زندگی گزار رہا ہے، گروپ میں رہتے ہوئے اس کے پاس پیسہ تھا لیکن سکون نہیں تھا، لیکن اب اس کے پاس سکون بھی ہے اور وہ پیسے بھی کما رہا ہے۔

میری محبت میری نجات

مختار الیاس ۲۰ سالہ نوجوان ہے جو اپنا ٹرک چلا کر گھر کا خرچہ چلاتا تھا۔ اس کے اپنوں نے ہی اس کے ساتھ دھوکا کیا اور دھوکے سے اس کا ٹرک بکوا کر ایران چلے

گئے۔ اب اس نوجوان کے پاس جو پیسے بچے تھے اُن سے اُس نے منشیات کا کاروبار شروع کرلیا، تاکہ دوبارہ ٹرک لے سکے۔ لیکن وہاں بھی اسے نقصان ہوتا گیا۔ اسکے بعد وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جو گینگ کا حصہ تھے گینگ میں شامل ہوگیا۔

اس محنت سے روزی کمانے والے نوجوان سے جب یہ پوچھا کہ گینگ کا حصہ بن کر وہ تشدد کرنے کو جائز سمجھتا ہے؟ اس کا کہنا تھا کہ "تشدد ہی ہماری بنیاد ہے اگر ہم تشدد نہ کریں تو ہمیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ گینگ کسی علاقے میں قابض ہوتا ہی خوف کی وجہ سے ہے، اگر ہم تشدد نہیں کریں گے تو ہماری بات کوئی نہیں سنے گا"۔

اس کام میں الیاس نے بہت پیسے کمائے اور جلد ہی اس قابل ہوگیا کہ وہ ادھار اُتار لے لیکن جب اس کے گھر والوں کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے پیسے لینے سے ان کار کرتے ہوئے اس سے رابطہ ختم کردیا۔ اس نے گینگ میں گزاری گئی زندگی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ "ایک بار پکڑا گیا تھا تو ایک جاننے والے نے پیسہ دے کے چھڑوادیا۔ میں جب گینگ میں تھا تو اپنے گھر میں نہیں سوتا تھا، میرا ایک بہنوئی کہیں سے آیا ہوا تھا وہ گھر میں تھا تو میرے گھر چھاپہ پڑ گیا، اسلحہ اور میرا شناختی کارڈ برآمد ہوا تو مجھے اور میرے بہنوئی کو لے گئے اور جھوٹا پرچہ بھی ڈال دیا، میں ابھی تک اس میں مفرور ہوں"۔

اس کی زندگی اس کو ایک عجیب موڑ پر لے آئی، الیاس جس لڑکی سے پیار کرتا تھا اُس کے گینگ کے لیڈر کو اس لڑکی سے پیار ہوگیا تھا۔ اس نے لڑکی کو خریدنے کی بھی کوشش کی لیکن الیاس کو یہ گوارہ نا ہوا اور اس نے لڑکی سے شادی کر کر ملک چھوڑ دیا اور ایران میں معمولی نوکری کرنے لگا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا ارادہ تو نہیں کہ وہ دوبارہ گینگ میں شمولیت اختیار کرے لیکن اگر "میری فیملی کو یا میرے بیوی بچوں کو نقصان پہنچا تو میں ایسا کرنے پہ مجبور ہو جاؤں گا"۔

اور پھر۔۔۔!

ارشاد ۱۸ سالہ نوجوان تھا، گینگ کے لڑکوں کو عیاشی کی زندگی گزارتے دیکھ کر اس کا بھی دل للچایا۔ ایک دن وہ بھی انہی کے نقشِ قدم پر چل پڑا اور گینگ کا حصہ بن گیا۔ گروپ میں شمولیت کے بعد ہتھ اور پیسہ ملتا تھا۔ کبھی دکانوں سے جا کر ہتھے کی وصولی کرنا ہوتی تھی، جہاں سے ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ تک مل جاتے تھے۔ ارشاد کہتا ہے کہ "جس کو بھی پکڑتے اس کو ٹی ٹی پستول دکھا کر سب کچھ نکلوا لیتے تھے، جیسے کہ موبائل یا پھر پیسے"۔

وہ بہت خوش تھا، پیسے آرہے تھے جس کی وجہ سے زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ ارشاد کے خیال میں "تشدد کرنا ناجائز ہے لیکن پیسے کی لالچ کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے"۔ یہ بات تو سچ ہے کہ لالچ بُری بلا ہے اور ایسے کاموں کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ گینگ میں رہ کے اُس نے کوئی خاص تربیت نہیں حاصل کی، بس ٹی ٹی پستول چلانی ہوتی ہے اور پھر انسان دوسرے لڑکوں کو دیکھتے ہوئے چیزیں سیکھ لیتا ہے۔ گھر والوں کو اس کی گینگ میں شمولیت کا علم نہیں تھا، وہ ان سے جھوٹ بولتا تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ جارہا ہے اور رات کو واردا تیں کرتا اور رات دیر سے گھر آتا، پھر اس کا سارا دن سونے میں گزر جاتا۔

گینگ کے بارے میں اس نے بتایا کہ "گروپ میں پانچ لوگ تھے اور ہمارا ایک لیڈر تھا، پھر اس کا آگے ایک لیڈر ہوتا ہے اور اس کا بھی آگے ایک لیڈر ہوتا ہے۔ اس کو یہ معلوم نہیں کہ اوپر کون ہے اور حکم کون دیتا ہے۔ مزید یہ کہ گینگ سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر گینگ چھوڑنا ہو تو گھر اور علاقہ چھوڑنا پڑتا ہے ورنہ گینگ والے آپ کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ وہ اپنے گروپ چھوڑنے کی وجہ بتاتا ہے کہ "اس کو احساس ہوا کہ وہ حرام کمارہا ہے اور لوگوں پر تشدد کررہا ہے"۔ یہ کام چھوڑنے سے اِس گھناؤنے جرم سے اُس کی جان تو چھوٹ گئی ہے لیکن پچھتاوا اس کی جان نہیں چھوڑ رہا۔

تشدد سے متاثرہ افراد

اس میں کوئی شک نہیں کہ نوجوان گینگ کے ممبران کی عیش وعشرت کی زندگی سے متاثر ہو کر گینگ کا حصہ بنتے ہیں۔ لیکن حقیقت ان پر تب کھلتی ہے جب اُن کے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو چکی ہوتی ہے۔ ہم نے یہاں ایسے لوگوں کو ذکر کیا ہے جو گینگ کے نوجوانوں کی زندگی سے متاثر ہو کر اِس راہ پر چل نکلے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس ہم تشدد سے متاثرہ افراد کا ذکر نہیں کررہے۔ بلکہ جن لوگوں نے یہ راہ اختیار کی انہوں نے اپنی ذات پر خود تشدد کیا

جس کے اثرات ان کی زندگیوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

دراصل وہ لوگ جو تشدد پسند گینگ کے نوجوانوں سے متاثر ہو کر اس راہ کو اپناتے ہیں وہ خود پر ظلم کرتے ہیں۔ وہ انجانے میں اس راہ پر تو چل پڑتے ہیں اور لوگوں کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں، لیکن اس کے بعد ان کی واپسی کی تمام راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ ان کو گینگ کا حصہ بننے کے بعد اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی مرضی سے گینگ چھوڑ دیں۔ خیر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کوئی شخص گینگ سے نکالا جا سکتا ہے، گینگ سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے موت۔

گینگ میں رہتے ہوئے بھی دوسرے گینگ کے ہاتھوں مارے جانے کے ڈر سے بھی اگر کوئی گینگ چھوڑ دے تو پھر بھی ہر وقت موت کے سائے سر پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ تب ہر ہاتھ ملانے والا بھی دشمن نظر آتا ہے اور مجبوری یہ کہ علاقہ یا ملک چھوڑنے کے علاوہ اپنی پہچان بدل کر یا روپوش ہو کر زندگی گزارنا پڑتی ہے۔

آخر میں ہم یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ صرف یہ ڈر اور خوف ہی نہیں جس کے سائے ان کے سروں پر منڈلاتے رہتے ہیں بلکہ ذہنی تناؤ، پچھتاوا اور ڈپریشن بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ایک خلش رہ جاتی ہے کیونکہ جو تشدد اور ظلم وہ کرتے رہے ہیں اس کا مداوا کسی طور نہیں ہو سکتا۔

فرقہ واریت

ایک ہی ماں کی گود میں تربیت پانے والے بچوں میں بھی بہت سے اختلافات ہو سکتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ ایک چھت کے نیچے ہنستے کھیلتے روٹھتے مناتے اپنی زندگیاں گزارتے ہیں۔ پھر ایک ہی علاقے میں بسنے والے لوگوں میں رنگ، زبان اور نسل کا فرق فراخ دلی سے تسلیم کرنا اتنا مشکل کیوں ہے؟ ایک ہی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ آخر کن تعصبات کا شکار ہو گئے ہیں، جبکہ بہت سے ممالک ایسے بھی ہیں جہاں مختلف مذاہب کے لوگ یکجان ہو کر اور اتفاق کے ساتھ اپنی زندگیاں ہنستے کھیلتے گزار دیتے ہیں۔

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ثقافتوں کا امتزاج ماحول کو پُرکشش بنا دیتا ہے۔ اس کی ایک خوبصورت مثال برطانیہ ہے جہاں ایشیائی، یورپی اور افریقی ممالک کے لوگ ہر طرح کے نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے باوجود امن سے رہ رہے ہیں۔ یہ تمام لوگ وہاں نا صرف خوشحال زندگیاں گزار رہے ہیں بلکہ ملکی ترقی میں بھی حصہ بن رہے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان کی اور خاص طور پر کراچی کے ان علاقوں کی صورتحال جہاں گینگ وار ہے اس کے بالکل متضاد ہے۔ جہاں ایک ہی علاقے سے تعلق رکھنے والے سندھی، بلوچی، پشتون اور مہاجر ایک دوسرے کی زندگیوں کے دشمن بن گئے ہیں۔

تمام ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لسانی گروہ گینگز کے ذریعے ایک دوسرے کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے آپس کے اختلافات کا نشانہ معصوم لوگ بن جاتے ہیں۔ اس تمام کے بارے میں مغیز جو کہ ایک ٹرک ڈرائیور ہے وہ کہتا ہے "مجھ پر کیے جانے والے تشدد کی وجہ یہ ہے کہ میں پٹھان ہوں"۔

تشدد کے شکار افراد کی کہانیاں

تشدد

اکبر شایان اور ایک اور شخص ریلی میں جا رہے تھے جب ان کو دو لوگوں نے پکڑ لیا۔ پان مارکیٹ لے گئے اور بہت مارا جس کی وجہ سے یہ دونوں بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو وہ ہم سے پوچھ رہے تھے کہ بتاؤ تم کس کے مخبر ہو، ہم نے ان سے معافی مانگی، سامنے مسجد سے کچھ لوگ نکل رہے تھے انہوں نے ہماری مدد کی اور ان ۱۲ لوگوں سے جو اسلحے اور ڈنڈوں سے ہماری پٹائی کر رہے تھے ان سے ہمیں چھڑوایا۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ "ہم اپنے سردار کے پاس گئے اور پیسے لے کر علاج کروایا، اکبر کے سر پر ۱۳ جب کہ دوسرے شخص کے سر پر ۶ ٹانکے آئے"۔

اس واقعے کے بعد اس کی نوکری چلی گئی، اس نے ادھار لے کر ایک دوکان کھولی اور اپنے علاج کے لیے پیسے بھی ادھار لیا۔ مزید اس نے اپنے جذبات کا اظہار

ان الفاظ میں کیا کہ " تشدد کے واقعات میں پولیس اور سیاسی پارٹیاں خود ملوث ہوتی ہیں کیونکہ سیاسی جماعتوں کو صرف کرسی سے مطلب ہے۔ تشدد خود حکومت کرواتی ہے اور لوگ گینگ کا حصہ اس لیے بنتے ہیں کہ ان کو طاقت مل جائے اور چند لوگ بدلہ لینے کی خاطر بھی گینگ میں شامل ہوتے ہیں"۔

فرقہ ورانہ تصادم

۲۳ سالہ سمیع اللہ خان اور احسان اللہ فاروقی موٹر سائیکل پر جا رہے تھے کہ گرومندر کے قریب موٹر سائیکل پنکچر ہوگئی۔ جب یہ پنکچر لگوا رہے تھے تو دو موٹر سائیکل سوار آئے اور فائرنگ شروع کر دی۔ سمیع کو ایک گولی بازو میں اور دو گولیاں پیٹ میں لگیں جبکہ احسان اللہ فاروقی کو پانچ گولیاں لگیں۔ سمیع اللہ نے بتایا کہ " پہلے احسان پر تین فائر کیے اور جب وہ جانے لگے تو احسان نے بلند آواز میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا، جس کی وجہ سے ان کو معلوم ہوا کہ یہ ابھی زندہ ہے تو انھوں نے دو اور فائر کیے، جن میں سے ایک گولی احسان کی گردن اور دوسری اسکے چہرے سے ہوتے ہوئے سر سے نکل گئی"۔

سمیع اور اس کا دوست وہاں گر گئے۔ جہاں یہ واقعہ ہوا وہاں کافی ٹیکسیاں اور رکشے کھڑے تھے لیکن کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کی مدد کرتا یا ان کے قریب آتا۔ آخر تھوڑی دیر بعد ایک شخص نے آ کر ان کو اٹھایا، اسی وقت پولیس موبائل پہنچ گئی جس میں انہیں عباسی شہید ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ۵ گولیاں لگنے کے بعد راستے میں تاج کمپلیکس کے پاس احسان نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں، لیکن سمیع ہسپتال پہنچنے تک ہوش میں تھا۔ اس کے بعد اس کو ایمرجنسی میں رکھا گیا، اس کا بلڈ پریشر اور شوگر کم ہوگئی تھی جس کی وجہ سے اس کو آپریشن کے لیے نہیں لے جایا جا سکتا تھا، پھر اس کو ہوش نہیں رہا جب ہوش آیا تو لیاقت نیشنل ہسپتال میں تھا جہاں میں ۲۲۔۲۳ دن رہا۔ اس کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ " ہسپتال کا پورا خرچہ میری جماعت نے اٹھایا"۔

حادثے سے جو ذاتی زندگی پر اثرات مرتب ہوئے اس پر سمیع کا کہنا ہے کہ " جسمانی طور پر کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ چلنے پھرنے میں اور کھانے پینے میں تکلیف ہوتی ہے"۔ سمیع کے مطابق " تشدد کرنا جائز نہیں ہے، ہر کسی کو بحث و مباحثے اور دلیل سے اپنے مسائل حل کرنے چاہیے اور اپنا مسلک نہیں چھوڑنا چاہیے اور نہ ہی کسی کا مسلک چھیڑنا چاہیے"۔ یہ بات تو طے ہے کہ کوئی بھی مسئلہ تشدد سے حل نہیں ہوسکتا، بلکہ یہ ہی وہ حالات ہیں جو ہمارے ملک میں انتشار کا سبب بن رہے ہیں۔

پولیس کا تشدد کے واقعات میں کردار کے حوالے سے بتاتے ہوئے سمیع کا کہنا تھا کہ " پولیس سیاسی جماعتوں کے زیر اثر ہے، اس لیے ایسے واقعات کو نہیں کنٹرول کر پاتی"۔ اس کے خیال میں لوگ یہ کام پیسے اور تعلیم کی کمی کے باعث کر رہے ہیں، اگر ان کو ان کاموں سے دور رکھنا ممکن ہے تو صرف اسی صورت میں کہ حکومت نوجوانوں کے لیے کچھ کرنے پر سنجیدہ ہو"۔

فرقہ واریت

مشہود بھی فرقہ واریت کا نشانہ بنا، اسے بھی نامعلوم جگہ لے جا کر مارا گیا اور بے ہوش ہونے پر کہیں پھینک دیا گیا۔ جب ہوش آیا تو اُس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ رکشہ چلا رہا تھا جب اسے انجان لوگ تشدد کا نشانہ بنانے کی غرض سے لے گئے، لیکن اب نہ وہ جگہ تھی اور نہ ہی اس کا رکشہ تھا۔ اس کا روزی کمانے کا واحد سہارا بھی اُس سے چھین لیا گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ "اب میں فارغ ہوں رکشہ بھی نہیں ہے"۔

مشہود علی نے اپنی لاچارگی اور بے بسی کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ "نہ میں قانونی کاروائی کروں گا نہ بدلہ لوں گا۔ اللہ ان سے بدلہ لے گا، ہم غریب آدمی کچھ نہیں کر سکتے"۔ اس کا خیال ہے کہ پولیس اس حوالے سے اگر کچھ کرنا چاہے تو کر سکتی ہے اور ان نوجوانوں کو جو پیسے کے لیے سیاسی پارٹیوں کا شکار ہو رہے ہیں روکنے میں کوئی اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

میرا قصور؟

فواد بخی کہتا ہے کہ "میں کام سے واپس آ رہا تھا کہ میرا نام پتہ پوچھا گیا۔ کیا تم بلوچ ہو؟ میں نے کہا، ہاں!۔ تلاشی لینے لگے، میں نے تلاشی نہیں دی، وہاں سے

بھاگا تو پیچھے سے فائر کیا، ایک گولی ہاتھ پر لگی ایک پاؤں پر، میں گر گیا جب یہ واقعہ ہوا تو وہاں پولیس بھی تھی، کسی نے نہیں بچایا، ۲ بندے تھے انہوں نے مجھے سکوٹر پر بٹھایا اور ہسپتال لے گئے، میں بے ہوش تھا، میرے گھر والوں کو بھی اطلاع دی۔ میرا ہاتھ ٹھیک کام نہیں کرتا گولی کی وجہ سے اور نہ ہی میں کہیں رپورٹ کر سکتا ہوں اگر میں بولوں گا تو پھر مجھے مار دیں گے، پولیس بھی ساتھ ملی ہوئی ہے"۔

کیا میں قصوروار ہوں؟

۲۴ سالہ کریم جو نیجو کو تقریباً ۲ سال پہلے جن حالات کا سامنا کرنا پڑا اسی کی زبانی جانیے۔ "میں ناگن چورنگی سے آ رہا تھا کہ ملینیم شاپنگ مال کے ساتھ جہاں گلستانِ جوہر کا پل ہے وہاں دونوں اطراف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ ۲ موٹر سائیکلیں آئیں جن پر ۶ لوگ سوار تھے۔ اس دوران جبار بھائی جو میرے ساتھ تھے شہید ہوگئے اور میں زخمی ہوگیا۔ ایک سزوکی والا ہسپتال لے گیا۔ اُس نے آغا خان ہسپتال میں چھوڑا وہاں پہنچنے تک میں بے ہوش ہی رہا۔ مجھے ایک گولی گردن پر، ایک جبڑے پر، ایک پیٹ پر اور دو پیٹھ پر لگیں اور ایک کراس ہو کے باہر نکل گئی اور ایک اندر چلی گئی۔ اس کی وجہ سے میں معذور ہوگیا ہوں میرا نچلا حصہ کام نہیں کرتا۔ کروٹ بھی نہیں لے سکتا مجھے کروٹ دلوائی جاتی ہے"۔

اس حالت میں پڑا یہ شخص امید لیے بیٹھا ہے کہ اس کو انصاف ملے گا، وہ چاہتا ہے کہ قانونی بدلہ لے۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ ان واقعات کو روکنے میں پولیس کوئی کردار ادا نہیں کرتی، موقع پر غائب ہو جاتی ہے اور بعد میں آ کر خانہ پُری کرتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ جس جماعت کیلئے سرگرم تھا اُسی کی وجہ سے اُسے راستے سے ہٹانے کے لیے انہوں نے اس پر تشدد کیا۔ نہ جانے ہم نے یہ جماعت بندی کہاں سے سیکھ لی ہے کہ ایک جماعت کے لوگ دوسری جماعت اور ایک سیاسی پارٹی کے لوگ دوسری سیاسی پارٹی کے لوگوں کے خون کے پیاسے ہوگئے ہیں۔ لیکن یہ شخص اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ جب کوئی واقعہ ہوتا ہے تو ہم اسی کی مدد کرتے ہیں جو ہماری جماعت کا ہو اس کے علاوہ ہم کسی کی مدد نہیں کرتے۔ کسی کا ساتھ دینا تو ایک الگ بات ہے لیکن کسی کی مدد کرنے کے لیے بھی اگر ہمیں پہچان کا سہارا لینا پڑ رہا ہے تو یہ ہمارے لیے نہایت افسوس کی بات ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم صرف انسانیت کی مدد کریں، خواہ کسی بھی جماعت، نسل یا فرقے سے تعلق رکھنے والے کو ہماری ضرورت ہو ہم اس کے کام آئیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ ہم بو رہے ہیں آخر میں ہمیں وہ ہی کاٹنا ہے۔

درندگی

اکرام امداد رکشہ چلاتا تھا، ایک دن اس کو کسی نے روکا وہ سمجھا کہ سواری ہے اس نے رکشہ روکا تو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُسے کہیں لے گئے۔ وہ لوگ اس کو مارتے تھے اور پوچھتے تھے کہ تم کس سیاسی جماعت کے حامی ہو؟ اس نے کہا کہ اس کا تعلق کسی جماعت سے نہیں ہے۔ اس کے ایسا کہنے پر اس کو جس تشدد کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس کے بارے میں وہ بتاتا ہے کہ "ایک بندے نے پلاس لیا اور میرا انگوٹھا دبایا اور کہا کہ اگر صحیح نہیں بتاؤ گے تو تمہارا ناخن نکال دیں گے۔ میں تو اللہ کی قسمیں کھاتا رہا اور سورتیں پڑھتا رہا کہ میں کسی کا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن وہ مارنے لگے، ایک بندے نے چھری ماری اور کہا کہ بتاؤ ورنہ کاٹتے رہیں گے"۔ وہ اس کے جسم پر چھریاں مارتے اور اس کے جسم کو پلاس سے دباتے جاتے۔ ایک دن اُسے مارنے کے ارادے سے گاڑی میں لے گئے۔ لیکن جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے۔ اس کو چلتی گاڑی سے دھکا دے کر پھینک دیا، اس کا سر ایک پتھر پر لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ نا جانے وہ ہسپتال کیسے پہنچا جب گھر میں اس کا رابطہ ہوا تو گھر والوں نے بتایا کہ "تم ۱۵ دن بعد ملے ہو"۔

اتنے بڑے سانحے سے گزرنے کے بعد اس کا کہنا ہے کہ "مجھے تو گھر سے باہر جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، اگر آپ ان کو میرے سامنے لے آئیں تو خوف سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ مجھ میں ایسا خوف بٹھا دیا ہے کہ میں تو خوف سے گھر سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ اگر وہ سامنے آ جائیں تو میں تو خوف کے مارے بھی ان کا نام نہ لوں۔ لیکن دل سے ضرور چاہوں گا کہ ان کو سزا ملے۔ لیکن خوف کے مارے ان کو پہچانوں گا بھی نہیں اور پولیس کو میں کیا بتاؤں میں تو کچھ نہیں کر سکتا"۔

ان درندہ صفت انسانوں کے لیے اس کا پیغام ہے کہ "اللہ کا خوف کرو۔ جو تم نے میرے ساتھ کیا وہ اگر تمہارے بہن، بھائی کے ساتھ ہو یا تمہارے اپنے ساتھ ہو تو کتنی تکلیف ہوگی۔ اگر میرے پاس طاقت ہو اور میں تمہارے ساتھ یہ کروں تو تم کیا کرو گے۔ اگر میں تمہارے پاؤں سے ناخن اکھاڑنے کی کوشش کروں تو کتنی تکلیف ہوگی۔ اگر میں تمہیں بلیڈ ماروں تو تمہیں کیسا لگے گا۔ جو مجبور ہے اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ۔ اللہ کے خوف سے ڈرو جو ہمارے ساتھ ہوا ہے اس سے کہیں بُرا ہوگا تمہارے ساتھ۔ خود بھی خوف کھاؤ اور دوسروں کو بھی بتاؤ"۔

نشانہ

۲۴ سالہ رضوان کو غلط فہمی کی بنیاد پر چند لڑکے اٹھا کر لے گئے اور اس کو کہا کہ تمہارا تعلق کسی سیاسی جماعت سے ہے، ہم کسی سیاسی جماعت کے بندے کو یہاں نہیں رہنے دینا چاہتے۔ ۲ دن اس پر تشدد کیا گیا اور اس کے بعد ایک لڑکے کے کہنے پر کہ "ہوسکتا ہے ہم کسی غلط آدمی کو اٹھا کے لے آئے ہوں، ایک جگہ پھینک دیا"۔ جہاں وہ پھینک کر گئے، خوف کے مارے لوگ اس کے پاس نہیں آرہے تھے۔ اس واقعے کے بعد اس کے دوستوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پولیس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اس نے کہا کہ "ہماری فورسز نے تو ان سے پیسے لے کر ان کو چھوڑ دینا ہے اور کل وہ پھر ہمارے سر پر ڈنڈا لے کر کھڑے ہوں گے اور فورسز ہماری سرپرستی نہیں کریں گی، بلکہ وہ سیاسی جماعت کا ہی ساتھ دیں گی۔ قانونی کاروائی کروں گا اگر قانون ساتھ دے تو۔ لیکن قانون بیچ راہ میں چھوڑ دیتا ہے اور ان ہی کی سرپرستی کرتا ہے کیونکہ پولیس والے سیاسی لوگوں سے ڈرتے ہیں"۔ اس نوجوان کا کہنا ہے کہ ناجائز اسلحے کو ختم کیا جائے۔ مزید یہ کہ اگر میرٹ پر نوکری نہیں ملے گی اور گینگ والے ڈبل خرچہ دیں گے تو ممکن ہے کوئی بھی گینگ کا حصہ بننے پر مجبور ہو جائے۔

میری پہچان میرا گناہ

کیا پہچان اتنا بڑا گناہ ہے کہ جب چاہے، جہاں چاہے کوئی آپ کے ساتھ کوئی بھی سلوک کر کے چلا جائے اور آپ اس کے آگے بے بس رہیں۔ اسی بنا پر کرامت مرزا کو بھی مظالم کا سامنا کرنا پڑا، آیئے اس کی داستان اسی کی زبانی سنتے ہیں "میں کام سے گھر آرہا تھا تو ۴۔۵ لوگوں نے راستے میں آواز دی، میں نہیں رکا تو گھٹنے میں گولی ماردی اور اٹھا کر لے گئے۔ ۷۔۸ گھنٹے مارا اور پھر کھارادر میں پھینک دیا"۔ ہمیں یہ معلوم تھا کہ کراچی کے حالات ایسے ہیں کہ ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فکر کرتا ہے۔ پھر بھی ہم نے ایک سوال پوچھا کہ "لیاری کی اتنی بڑی آبادی میں آخر کوئی تو مسیحا ہوگا جس نے مدد کی ہوگی؟ جس کا جواب وہی تھا، جو ہم بارہا سنتے آئے ہیں "جب گولی چلی تو سب بھاگ گئے پولیس بھی کھڑی تھی کوئی مدد کے لیے نہیں آیا۔ ہم بلوچ ہیں اور لیاری کے رہائشی ہیں اس لیے کسی نے مدد نہیں کی"۔

یہ نوجوان اس نسلی تعصب کا اکیلا شکار نہیں، یہ ستم اس کے خاندان کے ساتھ پہلے بھی ہو چکا ہے جس کے بارے میں اس نے بتایا کہ میرے چچازاد بھائی کو کھارادر غوثیہ مارکیٹ میں مار دیا تھا۔ اس کو کسی پر بھی اعتبار نہیں ہے اس کا کہنا ہے کہ "مہنگائی اور لالچ بھی ایک وجہ ہے جس کی وجہ سے لوگ تشدد کا شکار ہو رہے ہیں"۔

یہ نسلی تعصب بھی کسی ایک داستان تک محدود نہیں ہے، بے شمار لوگ اس کا نشانہ بن رہے ہیں جن میں سے ایک فواد بھی ہے۔ اس نے اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ "میں کام سے واپس آرہا تھا کہ راستے میں مجھے روکا گیا اور میرا نام پتہ پوچھا اور پوچھا کہ بلوچ ہو؟ میں نے کہا! ہاں۔ تلاشی لینے لگے میں نے تلاشی نہیں لینے دی، وہاں سے بھاگا تو پیچھے سے فائر کیا، ایک گولی ہاتھ میں لگی اور ایک پاؤں میں، میں گر گیا، جب یہ واقعہ ہوا تو وہاں پولیس بھی تھی کسی نے نہیں بچایا۔ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد ۲ بندوں نے مجھے سکوٹر پر بٹھایا اور ہسپتال لے گئے، میں بے ہوش تھا، ہسپتال میں ہی میرے گھر والوں کو اطلاع دی گئی"۔

اس نوجوان کو ہاتھ اور پاؤں پر گولی لگی تھی اب اس کا ہاتھ اور پاؤں صحیح کام نہیں کرتے۔ اس سارے واقعے کے بعد اس نوجوان میں اتنا ڈر اور خوف ہے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں پر اس قدر بے اعتباری ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اس نے اس واقعے کے بارے میں رپورٹ درج نہیں کروائی، اور کروانا بھی نہیں

چاہتا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ "اگر وہ ان لوگوں کے خلاف آواز اٹھائے گا تو اس کو دوبارہ تشدد کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ پولیس بھی انکے ساتھ ملی ہوئی ہے"۔

سیاست کی نظر

۱۸ سالہ امداد بیگ کو ۹ دن تک تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اس کا سر پھاڑ دیا گیا، ٹانگ توڑ دی، بازو پر کٹ لگائے گئے اور کاروبار بھی چھین لیا گیا، اس کہ وجہ صرف یہ تھی کہ اس سے سیاسی جماعت والے بھتہ مانگتے تھے۔ اس کو لڑکپن میں ہی یتیم کر دیا گیا تھا، اب وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر لیاری آ گئے ہیں۔ ان کا جینا حرام کر دیا گیا تھا اور ان کو کہا جاتا تھا کہ ان کا دوسری سیاسی پارٹی سے تعلق ہے۔ نہ جانے اس شہر میں کتنے ہی لوگ ان سیاسی پارٹیوں کی سیاست کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اس معصوم کے باپ کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے گئے اور ایک دن اس کو گولیاں مار کے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ستم یہ ہی نہیں بلکہ ہسپتال میں ڈاکٹروں کو اس کا علاج کرنے سے بھی روک دیا گیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے علاقے میں ایک سیاسی پارٹی دوسرے کو نکلنے نہیں دیتی، ۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں ماں، بہن، بیٹی تک کی عزت محفوظ نہیں۔ جس معصوم کے کندھوں نے اپنے باپ کا جنازہ اٹھایا ہو اور زمانے کی ٹھوکریں کھائیں ہوں اس میں مزید ہمت نہیں تھی کہ وہ مزید کچھ کہتا، شاید کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

مظلوم وہ جسے موقع نہ ملا

۲۴ سالہ فدا الانگونفون آنے پر سالے کے گھر سہراب گوٹھ کی جانب چل پڑا۔ الآصف اسٹاپ پر پہنچا تو "ایک گاڑی آگے تھی اور ایک پیچھے تھی، بیچ میں میں تھا، بس آگے والے نے فائرنگ شروع کر دی، چار گولیاں ماریں، تین گاڑی کو لگیں، ایک مجھے لگ گئی۔ اس کے بعد کچھ اکنڈی کے ساتھ تقریباً ڈھائی گھنٹے پڑا رہا۔ پھر چند لوگ آئے اور جو کچھ جیب میں تھا وہ لے گئے۔ چند لمحے بعد کچھ اور لوگ آئے اور انہوں نے مجھ سے نمبر لے کر میرے گھر فون کیا تو میرے بھائی مجھے لینے آئے۔ مشکل سے پولیس والے نے چھوڑا تو پٹیل ہسپتال پہنچے، انہوں نے ۱۸ ایکسرے کیے لیکن گولی نہیں ملی۔ اس کے بعد پی این ایس شفاء لے کر گئے، دو ایکسرے ہوئے اس میں گولی نظر آئی اور میرا آپریشن ہوا"۔

ان حالات میں عوام ایسے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد اس لیے نہیں کرتی کہ کہیں الٹا ان پر ہی کسی کاروائی کا الزام نا آجائے۔ کچھ ایسے ہی حالات کا سامنا فدا کو بھی کرنا پڑا۔ جب وہ سڑک کے کنارے پڑا تھا تو لوگ ڈر کے مارے اس کے پاس نہیں آ رہے تھے اور جس علاقے میں اس کے ساتھ یہ کاروائی ہوئی وہ بھی انجان تھا۔ "جہاں واقعہ ہوا وہاں کوئی جاننے والا نہیں تھا کہ کوئی مدد کو آتا اور عوام بھی ڈر کے مارے پاس نہیں آتی کہ پولیس ان سے تفتیش نہ کرنا شروع کر دے"۔

اس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ یہ سب کس نے کیا اور کیوں کیا اور اس کو اس حال میں پہنچا دیا کہ "اب کوئی وزنی چیز نہیں اٹھا سکتا اور کیونکہ اچھی نوکری نہیں ملتی اسلیئے لوگ عزت بھی نہیں کرتے"۔ قانونی کاروائی کے بارے میں اس نے کہا کہ " کوئی ملے گا تو قانونی کاروائی کروں گا۔ مزید پولیس کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ "پولیس کو سب پتہ ہوتا ہے، جہاں واردات ہو پولیس وہاں نظر ہی نہیں آتی"۔

"یہ ہی حال سیاسی پارٹیوں کا ہے وہ یہ سب کام کروا رہی ہیں، غریب بندہ دیکھ کر وہ بھی اپنا کام کروا لیتی ہیں"۔ اپنے ساتھ بیتنے والے اس واقعے کا ذمہ دار وہ غربت، تنگدستی اور بے روزگاری کو ٹھہراتا ہے، جس کی وجہ سے نوجوان یہ راستہ اپناتے ہیں۔ وہ یہ ہی کہتے ہیں کہ خود تو مر رہے ہیں ساتھ میں ۲-۴ اور بھی مار دیتے ہیں۔ اس کے خیال میں کوئی ان کو ایسا کرنے پر مجبور نہیں کرتا یہ لوگ خود اپنی مرضی سے یہ راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور یہ گینگ کبھی ختم نہیں ہوں گے، ایک بندہ ہوتا ہے تو دوسرا بن جاتا ہے۔ اپنے ملک کی عدلیہ اور انصاف نہ ملنے کے نظام سے اس نوجوان کو کافی شکایت ہے، اس کے خیال میں بندہ بوڑھا ہو جاتا ہے مگر اس کو انصاف نہیں ملتا۔ اس کا گینگ کے لیے کام کرنے والوں کے لیے پیغام ہے کہ زندگی اللہ کا تحفہ ہے اور ایک ہی بار ملتی ہے اس کی قدر کریں۔

پرتشدد افراد کی کہانیاں

گینگ کے سابقہ ممبران نے یہ اعتراف کیا ہے کہ گینگ کے پیچھے سیاسی پارٹیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہے کہ وہ لوگوں کو ان بنیادوں پر تشدد کا

نشانہ بناتے ہیں۔اوپر دیے گئے انٹرویوز میں تشدد سے متاثرہ افراد کی سچی کہانیاں پیش کی گئیں ہیں۔تشدد پسند افراد نے یہ بات واضح طور پر نہیں کہی کہ وہ لوگوں کو نسلی اور لسانی بنیادوں پر نشانہ بناتے ہیں، اسی بات کے پیشِ نظر ان کہانیوں کو دیگر عناصر کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔

انتقام کی آگ/عدم انصاف

تشدد سے متاثرہ افراد اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی، اپنے علاقوں میں گینگ وار کے عروج اور عدم انصاف کو ریاست کی نااہلی سے منسلک کرتے ہیں۔محض یہ ہی نہیں بلکہ دونوں گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی آپ بیتی کا قصوروار بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ٹھہراتے ہیں۔یہ ایک نہایت افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے اس قدر بدنام ہیں کہ ہم ان پر اعتماد ہی نہیں کرتے۔جتنے بھی انٹرویوز کیے گئے خواہ وہ تشدد سے متاثرہ افراد کے ہوں یا تشدد پسند افراد کے، ان سب نے انہی خیالات کا اظہار کیا۔انٹرویو دینے والے چند نوجوانوں کا کہنا تھا کہ پورے کراچی میں محض ان کے علاقے ایسے ہیں جہاں پر پرتشدد واقعات زور پکڑ رہے ہیں، آئے دن ہڑتالیں ہوتیں ہیں، لوگ ڈر اور خوف میں زندگیاں گزار رہے ہیں اور ان کو یہ بھی معلوم کہ نہیں کہ وہ کب نشانہ بن جائیں۔اس کے علاوہ ان علاقوں میں کام کرنے والے گینگ اپنی جڑیں مضبوط کرتے چلے جارہے ہیں۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں سے ان کا اعتبار کیسے نہ اٹھے؟ تشدد کا نشانہ بننے والے نصراللہ نے ایف آئی آر کٹوائی تو اس نے اپنے ساتھ پیش آنے والے اندھے قانون کے انصاف کے بارے میں بتایا کہ "مجھے جھوٹے کیسوں میں اندر کردیا گیا۔سب کے پاس جارہا ہوں لیکن کوئی انصاف نہیں کررہا۔قانون کو بھی پیسہ چاہیے ہوتا ہے"۔قانون کے استظام کے بارے میں گینگ کے سابقہ ممبر نے کہا کہ "ایک دو بار چھوٹے کیسوں میں پکڑا گیا تھا لیکن تھانے سے ہی ضمانت ہوگئی تھی"۔

لیاری، کورنگی اور سلطان آباد کے حالات ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے، ان حالات کے ذمہ دار وہاں پر بسنے والے خود ہی ہیں۔نوجوانوں کی تعلیم سے دوری اور گینگ میں شمولیت ان حالات کو بد سے بدتر بناتی جارہی ہے۔لیاری کے بارے میں بات کرتے ہوئے ایک نوجوان نے کہا کہ "ہمارے علاقوں کے حالات کی قصوروار حکومت ہے۔لیکن شاید ان تمام حالات کی ذمہ داری حکومت پر عائد نہیں ہوتی بلکہ قانون نافذ کرنے والے اداروں، سیاسی جماعتوں اور سب سے بڑھ کر وہاں کے لوگوں کے ملی جلی لاپرواہی کا نتیجہ ہے"۔

لیاری کے علاقے میں تشدد کا شکار بننے والے ایک نوجوان فٹ بالر کو ان درندہ صفت انسانوں نے اس قابل بھی نہیں چھوڑا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی جیتی گئی ٹرافیوں سے دھول مٹی ہٹا سکے۔ہمیں ہوش تب آتا ہے جب امید و آس کی ایک شمع بھی روشن نظر نہیں آتی، واپسی کے سفر کی تمام کشتیاں خاک ہوچکی ہوتی ہیں اور ہمیں سہارا دینے اور تھامنے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔باقی بچتا ہے تو صرف اور صرف پچھتاوا! جس کا ازالہ ناممکن ہے۔

سیاسی پارٹیوں کے بارے میں نوجوانوں کا کہنا ہے کہ "تمام فسادات کی اصل بنیاد ہی سیاسی پارٹیوں نے ڈالی ہے۔اگر کوئی بڑے مسئلے میں پھنس جائے تو مدد بھی گینگ کے لوگ ہی کرتے ہیں اور اگر کسی کو راستے سے ہٹانا ہو تب بھی ہم سے ہی کام کرواتے ہیں۔گینگ کو چلانے میں اصل ہاتھ سیاسی کارکنوں کا ہی ہے۔پولیس نے بھی فری ہینڈ دے دیا ہے اور علاقے سے باہر بھی کارروائیاں کرنا شروع کردی ہیں"۔

انسان فطرتاً معصوم پیدا ہوتا ہے، چند اظہارات کے علاوہ زیادہ تر رویے انسان دنیا میں اور دنیا والوں سے ہی سیکھتا ہے۔رویوں کی پختگی اور ان کا اظہار انسان اسی طرح کرتا ہے جیسا وہ اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔تشدد پسندانہ رویے بھی انسان ماحول ہی سے سیکھتا ہے۔جیسے جیسے ہم پُرتشدد ماحول کا حصہ بنتے جاتے ہیں ہمارے رویوں میں تشدد پسندی سرائیت کرتی جاتی ہے۔صرف یہ ہی نہیں ہمارے رویوں پر اثر انداز ہونے والے عناصر میں موسم کی تبدیلی، اور تشدد کی جانب مائل کھیلوں کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔اس کے علاوہ مختلف کھیلوں میں حصہ لینے سے بھی انسانی رویے تبدیل ہوتے ہیں۔یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری زمین کھیلوں اور کھلاڑیوں کے لیے تنگ ہوتی جارہی ہے، اور خون کی ہولی کا کھیل عام کھیل بنتا چلا جارہا ہے۔انسان کو جب رویوں کے اظہار کے مواقع نہیں ملتے تو نتیجتاً وہ جارحانہ رویے اپناتا ہے۔

ہم لوگ اس قدر تناؤ کا شکار ہیں اور ڈر اور خوف میں زندگی گزار رہے ہیں پھر بھی ہمیں سمجھانے والا اور ہمیں صحیح راہ دکھانے والا کوئی نہیں۔ ایک ایسا نوجوان جو سلطان آباد میں رہ رہا ہے، اور اس کے سینے میں سلگتی آگ ان پاکستانیوں سے نفرت کا اظہار ہے جن کی وجہ سے وزیرستان میں اس کا گھر بار ختم ہو گیا۔ وہ اس کا قصوروار ان پاکستانیوں کو ٹھہراتا ہے جنہوں نے امریکا کو وہاں بم گرانے کی چھوٹ دی۔

یہ بات تو انٹرویوز سے ثابت ہو گئی ہے کہ زیادہ تر نوجوان گینگ کا حصہ اپنی مرضی اور اپنے حالات سے تنگ آ کر بنے لیکن ان میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو انتقام اور بدلے کی آگ میں جلتے ہوئے اس راستے پر چل نکلے۔ جس کے بارے میں ان نوجوانوں کا کہنا ہے کہ اگر قانون سے انصاف ملتا اور قانون نافذ کرنے والے اداروں پر اعتبار ہوتا تو شاید کوئی یہ راستہ اختیار نہ کرتا۔ طیش اور غصے میں نوجوان ان لوگوں سے انتقام لیتے رہے جو شاید قصوروار بھی نہیں تھے، یہ انتقام ہے یا کچھ اور یہ ایک سوال ہے؟

ایک نوجوان اپنے والد کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اس پیشے میں آیا لیکن اس کے اس فیصلے نے اس کو اس کی ماں کے سائے سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا۔ کہیں کسی کو اس پیشے نے بھائی کے جنازے پر لا کھڑا کیا تو کسی کی خاندانی دشمنیوں اور انا نے اس کو اس کام کی طرف راغب کر دیا۔ ایک نوجوان کا کہنا ہے کہ وہ بدلہ لینے کی غرض سے گینگ کا حصہ بنا۔

وہ نوجوان جس نے انتقام لینے کے لیے گینگ میں شمولیت اختیار کی اس نے کن وجوہات کی بنا پر گینگ چھوڑا؟ آیئے مندرجہ ذیل کہانیوں سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

پرتشدد افراد کی کہانیاں

انتقام

۲۵ سالہ مرزا سلیم ۲۰ سال کی عمر میں گینگ کا حصہ بنا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کو گینگ میں ملوث کیا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ لیاری میں بہت سے گینگ ہیں۔ "میرے ماموں کو ایک گروپ کا سپوٹر سمجھا جاتا تھا، جو کہ غلط ہے۔ گینگ میں ہمارے رشتہ دار تھے لیکن کوئی سپورٹ نہیں تھی۔ مخالف پارٹی میرے ماموں کو گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے گئی۔ ہم یہ سمجھے کہ کسی نے تاوان کے لیے ایسا کیا ہے اور ہم گفتگو کر کے کوئی راستہ نکالیں گے، لیکن مخالفین نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا۔ ہمیں فون آیا کہ وہ زخمی حالت میں ملے ہیں جب ہم وہاں پہنچے تو پتہ لگا ان کی موت ہو چکی ہے"۔

بجائے اس کے کہ وہ اس واقعے کے بعد اس قسم کے کاموں سے دور رہتا وہ اس کا حصہ بن گیا۔ بدلے کی آگ تھی جو اس کے دل میں دھک رہی تھی، اس آگ نے اس کو جس الاؤ میں لا کھڑا کیا تھا اس کا اندازہ اس کو اس وقت نہیں ہوا جب وہ گینگ کا حصہ بنا۔ اس نے اپنے خاندان کے بارے میں بتایا کہ "ہم کاروباری لوگ ہیں اور ذاتی کاروبار کرتے ہیں۔ ہمیں اپنا بچاؤ بھی کرنا تھا اور بدلہ بھی لینا تھا۔ چونکہ ہم بلوچ ہیں تو ہمارے سر پر ساری زندگی بدلہ سوار رہتا ہے کہ جب تک بدلہ نہیں لو گے مردوں میں شمار نہیں ہو گا اور لوگ طعنہ دیں گے کہ یہ اس قابل ہی نہیں ہیں بس اسی بدلے کی آگ میں میں اس راہ پر چل پڑا"۔

وہ جس گینگ کا لیڈر رہا اس نے اس گینگ کے کام کے بارے میں بتایا کہ "گینگ کے کام کرنے کا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے، جن نوجوانوں میں کچھ کرنے کا جذبہ ہو ان کی بھرتی ہوتی ہے، وہ مخالف پارٹی کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کے لیے نوجوانوں کو استعمال کرتے تھے اور ان سے چھوٹے موٹے کام لیتے تھے۔ بس یہاں سے ہی ان کی تربیت شروع ہو جاتی تھی"۔

گینگ چھوڑنے کے بارے میں اس نے بتایا کہ "گینگ مرضی سے نہیں چھوڑ سکتے، جب تک جی رہے ہو آپ گروپ کے ساتھ منسلک رہو گے۔ مجھے تو فیملی کی طرف سے دباؤ تھا، ماں کی التجا تھی کیونکہ ہمارے خاندان میں پہلے ہی اتنی شہادتیں ہو چکی تھیں، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی اور بھی چلا جائے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ میں آہستہ آہستہ سسٹم سے دور ہوتا گیا، اب اس چیز سے دل بھر گیا ہے اب میں یہ سب نہیں کرنا چاہتا۔ بہت ظلم کیے ہیں اللہ پاک بس معاف کر دے"۔

پچھتاوا

محمد جبار ان نوجوانوں میں سے ہے جس نے بدلہ لینے کے لیے اس راستے کا تعین کیا۔ اس کے بھائی کو پولیس نے اٹھالیا اور دوسرے دن اس کی لاش ملی۔ یہ ۱۸ سال کا نوجوان اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے گینگ کا حصہ بن گیا۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب اس نے اپنے بھائی کے قاتل کا پتہ لگوا کے اس کو بھی ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ لیکن یہ کیا؟ اس کا یہ انتقام تو پورا ہو گیا تھا پھر بھی وہ گینگ کا حصہ بنا رہا۔ اس کے گینگ نے اس کی حوصلہ افضائی کی اور وہ اس کے بعد بنک ڈکیتی اور منشیات کا اڈہ چلانے میں بھی شامل رہا۔

اس کا کہنا ہے کہ "انتقام کی آگ نے اس کو اندھا کر دیا تھا اور اس وقت تشدد کرنا جائز لگتا تھا۔ گینگ کے لوگ اپنے لوگوں کو جیلوں میں نہیں رہنے دیتے اور نہ ہی پولیس ان لوگوں پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ لیکن یہ کیا ہوا کہ جب وہ "ایک بار پکڑا گیا تھا اور ۳ دن جیل میں رہا تو اس کے والدین نے ہی اسے وہاں سے نکلوایا"۔ اس کے پیچھے کوئی نہیں آیا، اگر کوئی اس کو بچانے والا تھا تو وہ اس کے اپنے ہی تھے۔

سکول کے زمانے کی باتیں بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ "جب میں سکول میں تھا تو تعلیم کا بہت رجحان تھا۔ ٹیوشن سنٹر تھے اور کھیلوں میں فٹبال عام تھا۔ اس وقت کوئی منفی رجحان نہیں تھا۔ بعد میں حکومت کی طرف سے یہ شروع کیا گیا کہ یہاں تعلیم کا رجحان نہ رہے، کھیل ختم کر دیا، بے روزگاری ہو گئی، منشیات اور جوئے کے اڈے کھول دیے گئے"۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک بھائی کو پولیس نے مار دیا جس کا بدلہ لینے کے لیے اس نے گینگ میں شمولیت اختیار کی اور ایک بھائی کو مخالف گینگ نے موت کی گھاٹ اتار دیا۔ ایک بھائی کی موت نے اس کو اس کام کی طرف راغب کیا تو دوسرے کی موت نے اس کو اس کام سے دور کر دیا۔ گینگ کے ممبران کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی مرضی سے گینگ چھوڑ سکیں۔ لیکن وہ اپنے ماں باپ کے ہاتھوں مجبور تھا جو اپنے ۲ جوان بیٹے گنوا چکے تھے، اس کے ماں باپ التجائیں کر رہے تھے کہ وہ اپنے بڑھاپے کا آخری سہارا بھی گنوانا نہیں چاہتے تھے اور پھر انہوں نے اس کے لیے دبئی جانے کا انتظام کر دیا، اب جبار وہاں روزی کماتا ہے اور چھٹیوں پر گھر آیا ہوا ہے۔ اس کو اپنی غلطی پر پچھتاوا ہے کہ ایک بھائی کا انتقام لینے نیا سے اپنے دوسرے بھائی سے بھی ہمیشہ لے کیے جدا کر دیا۔

یتیمی سے مسکینی کا سفر

۱۸ سالہ شہریار پر اُس وقت قیامت ٹوٹی جب اس کے باپ کو تشدد کر کے مار دیا گیا۔ اُس کے علاقے میں موجود گینگ کو نا جانے اس کے خاندان سے کیا دشمنی تھی کہ انہوں نے اس کے سر سے باپ کا سایہ ہی اٹھا دیا۔ اپنے باپ کو منوں مٹی تلے دفنانے کے بعد جذبات میں آ کر شہریار نے قسم کھائی کہ وہ اپنے باپ کے قاتلوں کو نہیں چھوڑے گا۔ اس وقت جب اس نے گینگ کا ممبر بننے کا فیصلہ کیا تو اس کا خیال تھا کہ "خون کا بدلہ خون ہی ہے"۔

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ گھر والے خاص طور پر ماں اپنے بچوں کی پرورش کرنے اور ان کو اچھے برے کی تمیز سکھانے میں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن یہ نوجوان ماں کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ جب اُس کی ماں نے اس کی الماری میں پستول اور دستی بم دیکھے تب بھی اس نے ماں کو جھوٹی تسلی دی اور اس کے بعد جب اس کی پڑوسن نے اسے گینگ کے لڑکوں اور اسلحے کے ساتھ دیکھا اور گھر میں اطلاع دی تب بھی اس نے ماں کو تسلی دی اور کہا کہ "لوگ آپکو پریشان کر رہے ہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے جیسا آپکو بتایا جا رہا ہے"۔ اور وہ معصوم ماں اپنی گناہگار آنکھوں پر بے اعتباری اور بیٹے پر اعتبار کرتی چلی گئی۔

آج کی مطلب پرست دنیا میں اور اپنے کام سے کام رکھنے والے دور میں ایک مخلص ہمسائے کا ہونا بھی اس کے لیے ایک نعمت تھا لیکن اس پر بھی اس شاطر نوجوان نے بہت چالاکی سے پردہ ڈال دیا۔ اس کے بارے میں شہریار کے الفاظ ہیں کہ "میں نے اپنی امی کو سنبھال کے رکھا ہوا تھا اور آپکو پتہ ہے کہ بے چاری عورتوں کو جیسے چلانا چاہو وہ چلتی ہیں وہ تو پھر بھی ماں تھیں"۔

شہریار نے بے زبان جانوروں (مرغیوں اور چوہوں) پر نشانہ پکا کرتے کرتے بے زبان لوگوں کو بھی نشانہ بنانا سیکھ لیا۔ اس نوجوان کا اپنے علاقے کے بارے میں کہنا ہے "پورا کراچی ترقی کرتا چلا گیا لیکن ہمارا علاقہ موئن جوداڑو بنتا گیا"۔ جس ظلم کا نشانہ یہ نوجوان بنا (کہ اس کو یتیم بنا دیا گیا) اس نے معصوم لوگوں کو بھی اسی طرح نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ "ہم کسی کے بھائی کو مارتے تھے کسی کے باپ کو مارتے تھے تو ایسے لڑکے اپنے انتقام کے لیے آتے تھے، وہ بدلہ لینے کے لیے گینگ میں شامل ہو جاتے تھے"۔

اس کی یتیمی اس کو جس راہ پر لے آئی تھی اس کی مسکینی نے اس کو اس راہ سے منہ موڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی زندگی کے ایک اہم موڑ کی کہانی وہ کچھ ان الفاظ میں سناتا ہے کہ "میرے ان کاموں کی وجہ سے میری ماں کو بہت صدمہ ہوا تھا۔ لیکن میں چاہتے ہوئے بھی یہ کام نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ میری والدہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں، یہ وہ وقت تھا جب رینجرز نے ہمارے علاقے کو گھیرے میں لیا ہوا تھا، مجھے لڑکوں نے بتایا کہ ہم چاروں طرف سے گھر چکے ہیں، اس وقت میری صرف ایک ہی خواہش تھی جسے میں ہر حال میں پورا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گرنیڈ پھینکو کچھ بھی کرو کیونکہ مجھے اپنی ماں کا آخری دیدار کرنا ہے کہ اچانک فائر ہوا اور میرے پیر پر گولی لگ گئی۔ میرے ساتھ جو ان لڑکے جو میرے گینگ میں تھے انہوں نے مجھے پتہ نہیں کس طرح نکالا اور میں نے امی کا آخری دیدار کیا، بس اسی دن میری وہ قسم ٹوٹی جو میں نے اپنے باپ کی قبر پر کھائی تھی، جس نے میری ماں کا سایہ بھی میرے سر سے اٹھا لیا"۔

یہ نوجوان گینگ چھوڑنا چاہتا ہے لیکن اس قدر مجبور ہے کہ اگر وہ چھوڑ دیتا ہے اور اپنے گینگ کو بتا دیتا ہے تو اس کا بھی وہ ہی انجام ہوگا جس انجام کو وہ معصوم لوگوں کو پہنچاتا رہا تھا۔ ابھی تک وہ اپنے گینگ کے لوگوں سے یہ ہی بہانہ کر رہا ہے کہ اس کا پاؤں ٹھیک نہیں ہوا اور وہ لوگ اس کی مدد بھی کر رہے ہیں اور اس کا علاج بھی کروا رہے ہیں۔ نہ جانے وہ اس دلدل سے کیسے نکلے گا یا اس کا انجام بھی وہ ہی ہوگا جو گینگ چھوڑنے کی قانونی سزا تصور کی جاتی ہے۔

تشدد سے متاثرہ افراد کی کہانیاں

عدم برداشت

آج کل کے نوجوانوں میں برداشت کا مادہ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ شاہ جہاں ایک ۲۲ سالہ نوجوان ہے جس کی غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے محلے کے لڑکے کسی عورت کو تنگ کریں۔ اس کا کہنا ہے کہ گینگ کے لڑکے راستے میں آتی جاتی عورتوں کو تنگ کرتے تھے۔ اُس کے منع کرنے پر اُسے پکڑ کے لے گئے اور بہت مارا جس کے نتیجے میں ۲ ماہ تک بستر پر پڑا رہا، اور افسوس یہ کہ اس کو بچانے میں کسی نے مدد بھی نہیں کی۔ لیکن یہاں پر یہ بات ختم نہیں ہوئی، اس کا کہنا ہے کہ اس واقعے کے بعد اس کی معاشی اور معاشرتی زندگی بہت متاثر ہوئی ہے۔ پہلے کام بھی کرتا تھا اور سکون سے رہتا تھا۔ اب کہیں آ جا بھی نہیں سکتا۔ یہ سب ہو جانے کے باوجود بھی اس نوجوان کے دل میں بدلے کی آگ جل رہی ہے، اس کا کہنا ہے کہ اگر موقع ملا تو میں بدلہ لوں گا بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس نوجوان کے بھی سیاسی پارٹیوں اور پولیس کے بارے میں وہ ہی خیالات ہیں جن کا اظہار باقی لوگوں نے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نوجوانوں کی گینگ میں شمولیت کی وجہ صرف پیسہ ہے، جن نوجوانوں کے یہ پڑھنے کے دن ہیں وہ گاڑیوں اور پیسوں کے چکر میں ان کاموں میں پڑ گئے ہیں۔

باقی کچھ بھی نہ رہا

عبید نے بتایا کہ "میں ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتا ہوں، مجھ سمیت میرے ۳ بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ہمارے والد کافی عرصے سے بحرین میں تھے اور وہاں سے انھوں نے ہمارے لیے محنت کر کے پیسہ کمایا اور بچایا تا کہ ہماری زندگی سنور جائے۔ ہم خوشحال زندگی گزار رہے تھے، خوش خوراک و خوش لباس تھے۔ ہمارے علاقے کے نامی گرامی گینگ جو ہمارے محلے ہی کے تھے ہم سے کافی حد تک جلتے تھے۔ ہمیں مختلف طریقوں سے تنگ کرتے رہتے تھے، وقتاً فوقتاً مجھ

سے پیسوں کا تقاضہ بھی کرتے تھے، ایک دو دفعہ میں نے ان کو پیسے بھی دیے۔ اسے ہی میری غلطی سمجھا جائے کیونکہ کہتے ہیں کہ شیر کے منہ کو خون لگانا۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھ سے بڑے پیمانے پر پیسوں کا تقاضہ کیا۔ میں نے اپنے طور پر ہر کوشش کی کہ انھیں کچھ لا کر دے دوں مگر رقم زیادہ تھی۔ جب میں ان کو دیکھتا تو چھپ جاتا، اگر وہ مجھے فون کرتے تو میں ان کا فون وصول نہیں کرتا تھا۔ ایک دن ان کے ایک کارندے کی نظر مجھ پر پڑی، جس نے جا کر ان کو بتایا تو انہوں نے مجھے دبوچ لیا اور الزام لگایا کہ تم دوسرے گینگ کے مخبر ہو مجھ سے میرا موبائل چھین کر اس کے فون بک کے نمبر دیکھنے لگے۔

وہ نشے میں تھے مجھے مارتے جا رہے تھے، آخر مجھ میں ہمت آئی اور میں موبائل چھین کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا، مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ بھاگتے بھاگتے میں اسی گلی میں گیا جہاں پر میرا گھر ہے۔ وہ سمجھے میں اپنے گھر چلا گیا ہوں، جبکہ میں گھر نہیں پہنچا تھا وہ میرے گھر پہنچ گئے اور مین گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر بہت گندی اور غلیظ گالیاں دینا شروع کر دیں۔ جب میرے گھر والوں سے برداشت نہیں ہوا تو انہوں نے آ کر ان سے پوچھا کہ آپ لوگ گالیاں کیوں دے رہے ہیں اور کیوں ہمیں علاقے میں ذلیل کر رہے ہیں؟ آخر کیا وجہ ہے میرے بچے نے کیا کیا ہے؟ جس سے ہمارے گھر والوں اور ان کے درمیان تو تو میں میں شروع ہو گئی۔ یہ لوگ نشے میں تھے انہوں نے اسلحہ اٹھا کر فائرنگ شروع کر دی۔ میرے گھر والے خوف سے گیٹ بند کر کے گیٹ کے پیچھے چھپ گئے۔ بدحواسی میں ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ گولیاں گیٹ پار کر کے بھی لگ سکتی ہیں۔ میرے گھر پر اندھا دھند فائرنگ کر دی گئی اور اس وقت گیٹ کے ساتھ کھڑے میری فیملی کا کوئی بھی فرد گولیوں کی زد سے نہیں بچا، یہاں تک کہ میرے معصوم بھتیجے بھی زد میں آ گئے، میری بہنیں، بھابھی، ماں اور والد سب کو گولیاں لگیں۔

ہمسائیوں نے میرے بھائی کو فون کیا اور اس واقعے کا بتایا، جب وہ گھر پہنچے تو سب خون میں لت پت پڑے تھے، تب ان کو ہسپتال لے جایا گیا۔ میری والدہ اور والد کی طبیعت بہت خراب تھی خدا کا کرم تھا کہ میری بہنوں اور بھابھی اور بچے خطرے سے باہر تھے اور ان کا علاج ہو گیا اور ان کو گھر جانے کی اجازت مل گئی مگر میری والدہ ۲ دن سے زیادہ جی نہیں پائیں۔ والدہ کے انتقال اور ان کو دفنانے کے بعد بھی ہم یہ بات والد سے چھپاتے رہے کہ ان کو اس بات کا صدمہ نہ ہو، مگر عیادت کے لیے آنے والے ایک شخص کے منہ سے میری والدہ کے انتقال کی خبر میرے والد کو ہو گئی، جو یہ بات برداشت نہیں کر پائے اور صدمے سے ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ہماری تمام جمع پونجی علاج میں لگ گئی۔ اور نوبت یہاں تک آ گئی کہ اگر ایک وقت کھا لیتے تو دوسرے وقت کھانے کو کچھ نہ ہوتا"۔

اس نوجوان نے کوشش کی کہ بھرپور قانونی کاروائی ہو اور ان کو انصاف ملے۔ اس حوالے سے اس نے رپورٹ بھی درج کروائی۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ قانون نے کوئی جوابی کاروائی نہیں کی "ہمارے کیس کی چارج شیٹ تک کورٹ میں پیش نہیں کی جا سکی۔ ہم تو جذبات میں تھے ہمیں منع بھی کیا گیا مگر ہم نے ان کا نام دے دیا مگر ہم سے زیادہ تو پولیس خوفزدہ ہے کہ ان کا نام آگے نہیں دیتی میرے خیال میں یہ سب لاقانونیت کی وجہ سے ہے۔ ہمارے علاقے میں دیکھا جائے تو ایسے بے شمار واقعات آپ کو ملیں گے مگر غریب لوگ ڈر کے مارے کچھ نہیں کہتے، سب خاموش ہیں"۔

بلیک آؤٹ

نوجوان چند خاص وجوہات کی بنا پر گینگ کا حصہ بنتے ہیں جن میں گینگ کی زندگی کا پرکشش ہونا اور بظاہر خوشحال اور بہادری والی زندگی کا تصور شامل ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کنوئیں میں گرنے والے نوجوانوں کے خیالات اس کے بارے میں بالکل متضاد ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو ایسی زندگیاں گزار چکے ہیں، ان کے خیال میں یہ ایک خواب اور دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

یہ زندگی گزارنے کے بعد ان کے دامن میں پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گینگ چھوڑنے کے بعد بھی ڈر کر اور روپوش ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کا یہ خوف کہ وہ جس گینگ کے لیے کام کرتے رہے ہیں اب ان ہی کے ہاتھوں نشانہ نہ بن جائیں گے، انہیں کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ ہمارے سامنے ایک ایسے شخص کا انٹرویو بھی آیا جو تمام تر مشکلات کے باوجود گینگ کا ممبر رہنا چاہتا ہے۔ اس کا گینگ ایک ایسی تنظیم ہے جس کا شمار پاکستان کی کالعدم تنظیموں میں ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے صحیح کر رہا ہے۔ وہ ابھی اسی بھنور میں ہے جس سے گزر کر باقی گینگ کے ممبران اپنی بیڑیاں پار لگا چکے ہیں۔

آیئے اس شخص کے خیالات جانتے ہیں۔

دوراہا

عثمان کا تعلق ایسی تنظیم سے ہے جو پاکستان کی کالعدم تنظیموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی گروپ میں شمولیت کی وجہ ایک فرقے سے نفرت اور ان سے انتقام لینا تھا۔ لیکن اس کے گھر والوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ کس حد تک اس نفرت کی آگ میں جھلس چکا ہے اور کہاں تک آگے چلا گیا ہے، جہاں سے واپسی کا راستہ دشوار اور کٹھن ہے۔ اس نے علاقہ غیر درہ آدم خیل سے تربیت حاصل کی ہے۔ اس نے اپنے اوپر ہونے والی قانونی کاروائیوں کے بارے میں کہا کہ "پہلی دفعہ جیل دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی پر ہوئی تھی اور ۱۲ دن جیل میں رہا تھا۔ ضمانت ہوئی اس کے بعد ایک دفعہ ۲ دن کے لیے جیل میں رہا۔ کچھ عرصے بعد بری ہوگیا۔ پھر محرم سے پہلے ۲ دن مجھے ۲۴ گھنٹوں کے لیے گرفتار کرلیا گیا"۔ عثمان اپنے گھر والوں کے سمجھانے اور باپ کی مار کے باوجود بھی اس تنظیم کا حصہ ہے اور اس کا حصہ رہنا چاہتا ہے۔ اس کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، وہ خاص ایک فرقے کے خلاف کاروائیوں میں ملوث رہا ہے۔ پولیس والے بھی اس کو اکثر اوقات پکڑتے رہتے ہیں کیونکہ اس کا تعلق ایک کالعدم تنظیم سے ہے۔ آپ اور ہم اسی طرح کی خبریں اکثر سنتے بھی رہتے ہیں کہ کالعدم تنظیم کے چند ممبران کو پولیس نے حراست میں لے لیا لیکن اس کے بعد وہ کس انجام کو پہنچے اور کہاں گئے اس کی خبر آج تک نہ ہوسکی۔

حقیقت تک رسائی

ہمارے سامنے ایک حقیقت یہ بھی آئی کہ وہ عناصر جن کی وجہ سے نوجوان گینگ کا حصہ بنتے ہیں بالآخر انہی کی وجہ سے گینگ چھوڑنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہیں ماں کی فریاد، کہیں بھائی کی جدائی، طاقت اور پیسے کے باوجود کہیں بے بسی اور خوف کے سائے ان کو اس دلدل سے نکالنے کا سبب بنے۔ طاقت کے نشے میں وہ بے گناہ لوگوں کو نشانہ بناتے رہے اور جب نشہ اترا تو یہ احساس ہوا کہ وہ جو سب لوگوں کے ساتھ کرتے آئے ہیں ان کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس حوالے سے ایک نوجوان نے کہا کہ "جب میری شادی ہوئی تو احساس ہوا کہ جس کو میں نے ٹارگٹ کیا تھا ہوسکتا ہے کہ اس کے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہوں اور یہ نہ ہو کہ کل میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو، اس ڈر سے میں نے یہ گروپ چھوڑ دیا"۔

ایک نوجوان نے کہا کہ "علاقے میں ۲۔۳ گینگ تھے جن کی آپس میں بنتی نہیں تھی، ایک گینگ نے میرے بھائی کو قتل کر دیا، ہم ۳ بھائی تھے بس میں بچ گیا تو میرے گھر والوں نے میرا دبئی جانے کا انتظام کر دیا۔ اب میں وہاں کام کرتا ہوں اور چھٹیوں میں آیا ہوا ہوں"۔ یہ وہ انتقام تھا جس کے لیے وہ گینگ کا حصہ بنا تھا۔ انتقام کی آگ نے جب اس کو دوسرے بھائی سے بھی دور کر دیا تو اس کو اس گھناؤنے دھندے سے دور ہونا پڑا۔

اختتام

ہم وہ قوم ہیں جو انفرادی آزادی اور سماجی ذمہ داری کی کشمکش میں مبتلا ہے لیکن دوسری طرف ہمارے ایک صنعتی اور ترقی یافتہ شہر کراچی کے رہائشی امن اور سکون سے کوسوں دور ہیں۔ یہ وہ شہر ہے جہاں تشدد کی گھٹائیں ہر وقت چھائی رہتی ہیں۔ اس صورتحال سے صرف کراچی کے رہائشیوں کو ہی نقصان نہیں ہو رہا بلکہ یہ حالات ہماری ملکی ترقی میں بھی خلل ڈال رہے ہیں۔ ان حالات نے ہمارے نوجوانوں کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ہمارے ملک کا قیمتی سرمایہ ہمارے یہ نوجوان ملک کے اثاثوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ان علاقوں میں امن کے قیام کیلئے قومی ذمہ داری کے علاوہ صوبائی حکومت کا کردار بھی ایک سوالیہ نشان ہے۔ گینگ وار کراچی کے توجہ طلب مسائل میں سے ایک ہے۔ یہاں سوال صرف حکومت کی ذمہ داری کا نہیں بلکہ اس کو حل کرنے کے حوالے سے اٹھائے گئے اقدامات کا بھی ہے۔

کراچی ایسے نوجوانوں کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے جو اپنوں کا ہی خون بہا رہے ہیں اور ان کو تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ ان میں وہ بے بس لوگ بھی ہیں جو گھٹ گھٹ کر زندگیاں گزارنے پر مجبور ہیں۔ چند تشدد پسند نوجوانوں کو انتقام کی آگ، پیسے اور طاقت کی حرص و لالچ، فرقہ وارانہ تعصب، سیاسی پارٹیوں کی چال

بازی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نظر اندازی نے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس آگ اور خون کے کھیل میں ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں نے آخر کیا کردار ادا کیا ہے؟

ایک طرف تو ہم انفرادی آزادی اور سماجی ذمہ داری کی بات کرتے ہیں، مگر دوسری طرف کراچی کے چند علاقوں میں لوگ آزادی سے زندگی گزارنے کے لیے بھی ترس رہے ہیں۔ ہمیں آزاد ملک دینے والے قائد محمد علی جناح کے مزار کے سائے تلے لوگ گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے یہ حالات ایک بڑا چیلنج ہیں۔ ہمیں یہ ڈر ہے کہ یہ چیلنجز ہمیں تاریخ کے بدترین ادوار کی طرف ہی نہ دھکیل دے۔

ہمارے معاشرے اور ہماری نسلوں پر ان حالات کے بدترین اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام دنیا میں بھی پاکستان کا نام ایک تشدد پسند، عسکریت پسند اور انتہا پسند ملک کی طرح ہونے لگا ہے۔ تاہم گینگ وار کا لفظ اور گینگ وار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات دنیا کے لیے نئے نہیں ہیں۔ بہت سے ممالک ان ادوار سے گزر چکے ہیں۔ ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جہاں ہر مسجد کا کوئی نہ کوئی مسلک ہے۔ ہمیں یہ مسلک پسندی اور فرقہ واریت سکھائی جاتی ہے، جو ہماری رگوں میں زہر قاتل کی طرح سرائیت کرتی چلی جا رہی ہے۔

پاکستان کی نوجوان نسل تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ یہ وہ نوجوان ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں لیکن جب یہ خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماریں گے اور ملک کے سرمائے کو نقصان پہنچائیں گے تو ملک کی معاشی اور معاشرتی ترقی کو سنگین خطرات کا سامنا رہے گا۔ صرف ہماری نوجوان نسل ہی نہیں بلکہ وہ بچے جو اپنے علاقوں میں خوف کے سایوں تلے پروان چڑھ رہے ہیں ان کا حال اور مستقبل دونوں خطرے میں ہیں۔

ان کہانیوں سے ظاہر ہے کہ کراچی میں ٹارگٹ کلنگ اور گینگ وار کے واقعات کو روکنے میں حکومت کچھ خاص دلچسپی نہیں لے رہی۔ اس کے علاوہ ان حالات کو بگاڑنے میں سیاسی جماعتوں کی مداخلت کا بھی کردار ہے۔ کیا یہ وہی جماعتیں ہیں جو ملک کو پرامن بنانے کے وعدے کرتی ہیں؟ تو پھر یہ ذمہ داری ان پر عائد نہیں ہوتی کہ اپنے علاقوں میں پرامن ماحول کو یقینی بنائیں؟ حکومت کی مخالف پارٹیاں یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ جو حالات وہ حکومت کے لیے پیدا کر رہی ہیں کل کو ان حالات کی بہتری میں کئی سال لگ جائیں گے۔ ان پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے کام کروائیں اور نوجوانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کریں۔ اور نہ ہی ان کو اپنی ذاتی سیاست کی بھینٹ چڑھائیں۔ جب ایک عام انسان ان کا نشانہ بنتا ہے تو اس کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس کو کس غلطی کی سزا دی جا رہی ہے۔

بلاشبہ محض سیاسی جماعتیں ہی اس کام میں ملوث نہیں ہیں۔ اس کام میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ذاتی دشمنیوں کے بدلے کے لیے یہ کام کر رہے ہیں۔ لیکن پھر اپنوں کے جدائی کا ہی خوف جو انہیں اس کام کی طرف لے کر آتا ہے، انہیں گینگ سے دور ہونے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔ شاید اسلحے کا بوجھ اٹھانے والے کندھوں میں اتنی طاقت باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنوں کو کندھا دے سکیں۔ جب وہ مشکل میں ہوتے ہیں تو مال و دولت اور طاقت ان کے کسی کام نہیں رہتی، نہ ہی وہ لوگ کبھی ان کی مدد کرتے ہیں جن کے اشاروں پر یہ نوجوان بنا سوال کیے اور جانچ پڑتال کیے تمام ناجائز کام کرتے ہیں۔ بے گناہ لوگوں پر اس قدر تشدد کرنا کہ ان کے جسم کے اعضاء کاٹ دینا اور ان کو محتاج بنا دینا کم سے کم انسانی عقل یہ گنوارا نہیں کرتی کہ کوئی نوجوان اتنا ظالم بھی کر سکتا ہے۔

جو لوگ تشدد سے متاثر ہو چکے ہیں اور وہ لوگ جو یہ کام کرنے کے بعد بھی یہ زندگی گزار رہے ہیں انہیں ہر آہٹ پر دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی انہیں نقصان نہ پہنچا دے۔ حکومت اور دیگر اداروں کو یہ چاہیے کہ ایسے اشخاص میں ذہنی تناؤ کو کم کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ یہ صرف ڈر اور خوف ہی نہیں جس کی وجہ سے یہ لوگ خوف کے سائے تلے زندگیاں گزار رہے ہیں بلکہ یہ اس سے بڑھ کر وہ احساسِ جرم اور خلش ہے جو ان کو چین سے جینے نہیں دیتی۔ وہ نوجوان جو گینگ کی زندگی اور ان نوجوانوں سے متاثر ہوتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اس تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیں جہاں ان کے سروں پر ہمیشہ موت اور خوف کے سایوں کی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ آخر میں ہم یہ امید اور دعا کرتے ہیں کہ وہ نوجوان جو برائی کی اس راہ کو چھوڑنے کا ارادہ کر چکے ہیں انہیں اس مقصد میں کامیابی ہو اور تاریکی اور اندھیروں کے سائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی سے دور چلے جائیں۔

ادارے سے آگاہی

انڈویجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش رجسٹرڈ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔ اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی، ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

انڈویجوئل لینڈ نے واضح طور پر قانون دانوں اور دیگر سول سوسائٹی اداروں کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کیا ہے اور خصوصاً میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کے حوالے سے اس کا نام پورے پاکستان میں جانا جاتا ہے۔